٥٨١/١٠

سلسلۂ مطبوعات انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) نمبر ۱۶۹

ملک محمد جائسی

از

سیّد کلب مصطفےٰ (بی۔ اے)

شایع کردہ

انجمن ترقیٔ اُردو (ہند)، دہلی

۱۹۴۱ء

قیمت ۱۲/

2/4/-

سلسلۂ مطبوعات انجمنِ ترقّیِ اُردو (ہند) ع ۱۶۹

ملک محمد جائسی

از

سیّد کلب مصطفیٰ (بی۔ اے)

شائع کردہ

انجمنِ ترقّیِ اُردو (ہند)، دہلی

سنہ ۱۹۴۱ء

فہرست مضامین



ملک محمد جایسی

[شمس‌العلما پروفیسر عبدالغني کي انگریزي تصنیف «دربار مغلیه میں فارسي ادب کي تاریخ» سے به اجازت مصنف نقل لي گئي]

"تعارُف"

ملک محمد جایسی اودھ کے رہنے والے اور بھاشا کے بڑے باکمال شاعر تھے۔ اُن کا نام آج کئی صدیوں کے بعد بھی اور تو اور اُن کے اہلِ وطن تک عزت اور فخر کے ساتھ لیتے ہیں اُن کی تصانیف کے اتنے مختلف نُسخے اور ترجمے ہندستان کے متعدّد مطابع سے شایع ہوئے ہیں جو یقیناً کسی ملک اور زبان کے شاعر کی شہرت کو چار چاند لگانے کے لیے کافی ہیں (چہ جائیکہ جب سوال ہو ہندستان جیسے قدرناشناس ملک اور بھاشا جیسی مُردہ زبان کے چار سو برس پُرانے شاعر کا ــــــ قلمی نسخے اس کے علاوہ ہیں)

ملک محمد کی ایک تصنیف یعنی پدماوت کے کئی نسخے ناگری رسم الخط میں ملتے ہیں جن میں سے بعض حواشی اور بین السطور معانی سے مزین ہیں اور بعض میں اُن کے حالات زندگی بھی مجملاً موجود ہیں اور اُن کے کلام پر نقد و تبصرہ بھی ہے۔

فارسی زبان میں ملک صاحب کے متعلق کچھ اذکار ہیں۔ اراکان کے راجا کی سرپرستی میں پدماوت کے ایک نسخے کا سترھویں صدی عیسوی میں بنگالی زبان میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔

انگریزی زبان میں بھی چند مضامین اور ڈاکٹر گری یرسن اور سدھاکر جی کا مرتّب کیا ہوا دیدہ زیب لیکن نامکمّل اڈیشن یعنی

"سدھاکر چندریکا" موجود ہی۔

اُردُو زبان میں بھی اصل نظم کے متعدّد نسخے کانپور، لکھنؤ، بریلی کے مختلف مطابع کے ہیں جو قریب قریب سو برس پُرانے ہیں۔ کسی میں کُل نظم کا ترجمہ اُردُو نظم میں ہی، کسی میں متن کے نیچے مطلب نثر میں لکھ دیا ہی، کسی میں محض حواشی ہی پر اکتفا کی ہی۔ البتّہ خود ملک صاحب کے متعلّق کوئی معلومات اُردُو زبان میں نہیں ہی سوائے ان چند سطروں کے جو آبحیات[1] میں مولانا آزاد دہلوی نے سپرد قلم فرمائی ہیں۔ یا اس ضمنی تذکرے[2] کے جو حضرت شبلی نے اپنے مضمون میں کیا ہی۔ جس کا عنوان

---

[1] "مسلمان بھی اس زمانے میں یہاں کی زبان سے محبت رکھتے تھے چنانچہ سولھویں صدی عیسوی شیر شاہی عہد میں ملک محمد جائسی ایک شاعر ہوا ہی اس نے پدماوت کی داستان نظم کی اس سے عہد مذکور کی زبان ہی نہیں معلوم ہوتی بلکہ ثابت ہوتا ہی کہ مسلمان اس ملک میں رہ کر یہاں کی زبان کو کس پیار سے بولنے لگے تھے۔ اس کی بحر بھی ہندی رکھی ہی اور ورق کے ورق اُلٹتے جاؤ فارسی عربی کا لفظ نہیں مِلتا مطلب اس کا آج مسلمان بلکہ ہر ایک ہندو بھی نہیں سمجھتا۔ کتاب مذکور چھپ گئی ہی اور ہر جگہ مل سکتی ہی اس لیے نمونہ نہیں لکھتا۔"

ماخوذ از آبحیات صفحہ ۱۸ مطبوعہ اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور کی وروازہ طبع نہم ۱۹۱۷ء

[2] "امیر خسرو کے بعد شیر شاہی عہد میں ملک محمد جائسی پیدا ہوئے وہ بھاکا زبان کے ایسے زبردست شاعر تھے کہ خود ہندوؤں میں آج تک اُن کا ہمسر پیدا نہیں ہؤا۔ پدماوت اُن کی مثنوی آج موجود ہی اور گھر گھر پھیلی ہوئی ہی۔ ہندوؤں میں

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳ پر ملاحظہ کیجیے

"مسلمان اور ہندی شاعری" ہے۔ اس کے علاوہ میر حسن دہلوی نے بھی

سب سے بڑا شاعر آخر زمانے کا کالیداس (تلسی داس) گزرا ہے جس نے رامائن کا بھاکا میں ترجمہ کیا ہے۔ نکتہ شناسوں کا بیان ہے کہ قدرتِ زبان کے لحاظ سے پدماوت کسی طرح رامائن سے کم نہیں اور اس قدر تو ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ پدماوت کے صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جاؤ۔ عربی فارسی کے الفاظ مطلق نہیں آتے اور یوں شاذ و نادر تو رامائن بھی ایسے الفاظ سے خالی نہیں۔

ملک محمد جائسی نے پدماوت کے سوا بھاکا میں اور بھی دو مثنویاں لکھی ہیں جو اُن کے خاندان میں اب بھی موجود ہیں لیکن افسوس اُن کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔

(مقالات شبلی حصۂ اوّل صفحہ ۱۹-۲۰ مطبوعہ آسی پریس محمود نگر لکھنؤ)

نوٹ۔ مقالات شبلی جلد دوم مطبوعۂ دارالمصنّفین ۱۹۳۱ء میں بھی صفحہ ۱۸ پر ملک محمد جائسی کے متعلق یہی مضمون ہے ایک مضمون ملک محمد جائسی کے متعلق رسالہ "تماہی" ہندستانی اکیڈیمی الہ آباد بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں نورالحسن صاحب کاکوروی کا ہے جو "ہندی زبان اور مسلمانوں کا طبعی میلان" کے عنوان سے شایع ہوا ہے مضمون طویل ہے مگر نفس معاملہ کے متعلق اقتباس حسب ذیل ہے۔

"ملک محمد جائسی نے حضرت امیر خسرو کے بعد شیر شاہی دور میں آنکھیں کھولیں۔ صاحب پدماوت کی شہرت ہندی ادب میں مسلم ہے ۱۵۴۰ء میں مثنوی پدماوت تصنیف کی۔ جو اب بھی موجود ہے اور گھر گھر پھیلی ہوئی ہے۔

نکتہ شناسوں کا دعویٰ ہے کہ قدرت زبان اور سادگی بیان کے لحاظ سے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۴ پر ملاحظہ کیجیے

چند اشعار ملک محمد جائسی کی شان میں ارشاد فرمائے ہیں[۱]۔

مثنوی پدماوت کسی طرح راماین سے کم نہیں ہی ملک صاحب موصوف کبیر کی تعلیمات سے متاثر تھے۔ راجہ صاحب امیٹھی ان کی بہت آؤ بھگت کرتے تھے۔ امیٹھی میں ان کا مزار مرجع خلایق ہی۔

پدماوت کے سوا دو کتابیں اکھراوٹ اور دوسری کا نام معلوم نہیں بھاکا زبان میں لکھی ہیں جن کے زیور طبع سے آراستہ ہونے کی نوبت نہیں آتی۔ افسوس ہی کہ کلام بے حسیٔ زمانہ سے مفقود ہی اکثر مقامات پر تلاش کی گئی نہ مل سکا۔"

صفحہ ۳۸۲ - ۳۸۳

[۱] تھے ملک نامے محمد جائسی — وہ کہ پدماوت جنھوں نے ہی لکھی
مرد عارف تھے وہ اور صاحب کمال — ان کا اکبر نے کیا دریافت حال
ہو کے مشتاق اُن کو بلوایا شتاب — تاکہ ہو صحبت سے اُن کی فیضیاب
صاحب باطن تھے وہ مست الست — لیک دنیا تو یہ ہی ظاہر پرست
تھے بہت بدشکل اور وہ بدقوی — دیکھتے ہی اُن کو اکبر ہنس پڑا
جو ہنسا وہ تو انھوں نے دیکھ کر — یوں کہا اکبر سے ہو کر چشم تر
ہنس پڑے ماٹی پہ تم ای شہریار — یا کہ میرے پر ہنسے بے اختیار
کچھ گنہ میرا نہیں ای بادشاہ — سُرخ باسن تو ہؤا اور مَیں سیاہ
اصل میں ماٹی تو ہی سب ایک ذات — اختیار اس کا ہی جو ہی اس کے ہاتھ
کوئی دن کے رنگ کوئی رات کے — رنگ ہیں دونوں یہ اُس کے ہات کے
سُنتے ہی یہ حرف رویا داد گر — گر پڑا اُن کے قدم پر آن کر

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵ پر ملاحظہ کیجیے۔

"ماخذ کی تلاش"

ملک محمد جائسی کے حالات فراہم کرنے اور اُن کے کلام کو اُردو میں منتقل کرنے کا خیال میرے دل میں اُس وقت سے ہی جب مَیں راہِ تالیف

بقیہ حاشیہ صفحہ ۴

الغرض ان کو باعزاز تمام اُن کے گھر بھجوا دیا پھر والسلام
صاحب تاثیر جو ہیں ای حسن دل پہ کرتا ہی اثر ان کا سخن

(ماخوذ از رموز العارفین مصنفہ میر حسن دہلوی ۱۱۸۸ھ)

نوٹ۔ یہ مثنوی ۱۳۵۲ھ میں شمس الاسلام پریس سے طبع ہو چکی ہی اور کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد دکن میں موجود ہی۔ اسی کمی کو محسوس کرکے ملک صاحب کے حالات زندگی ان چند صفحات میں محفوظ کیے جاتے ہیں اگرچہ چند صفحے ملک محمد جائسی کے کلام پر تبصرے اور اُن کی زندگی کے حالات کی تشریح کے لیے تو کیا اُن کو دنیائے ادب سے روشناس کرنے کے لیے بھی ناکافی ہیں ___ اللہ رے زمانے کی نیرنگی کہ جس نے اقلیم سخن پر حکومت کی ہو آج اُسے اہل سخن سے متعارف کرنے کی ضرورت پیش آتی ہی لیکن جو کچھ لکھا جارہا ہی وہ محض تمہید کے طور پر ہی اور اس لیے کہ شاید سمند ناز کے لیے تازیانہ ہو سکے ورنہ کسی شاعر اور ادیب کے کارناموں اور حالات زندگی کے بیان مختصر کے لیے بھی ایک طویل دفتر درکار ہی۔ خاصکر محمد جائسی کے لیے جن کو دوسروں کے مذہب کی روایتوں اور اُن کی زبان پر اتنا قابو تھا کہ پدماوت ایسی داستان نظم کی جسے دیکھ کر آج بیسویں صدی کے ادیب اور شاعر بھی انگشت بدنداں رہ جائیں۔

جائس۔ جنوری ۱۹۳۰ء سیّد کلب مصطفےٰ

وتصنیف کی صعوبتوں سے بالکل بے خبر تھا اور وہ دشواریاں تو میرے وہم میں بھی نہ گزری تھیں جو اس مرحلۂ خاص کے لیے مخصوص تھیں۔ لیکن ابتدا کر دینے اور ان دقتوں کے ایک حد تک پیش آجانے کے بعد میرے ارادوں میں اور زیادہ پختگی پیدا ہو چلی اور خیال ہوا کہ اگر مشکلات کے ساتھ ہمّت بھی بڑھتی گئی تو کچھ دُور نہیں کہ میرا مدّعا حاصل ہو جائے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ خیال بھی تقویت پہنچاتا رہا کہ تلاش ہو تو دارِ امکان میں کیا نہیں مل جاتا۔

لیکن بایں ہمہ کوئی مسالا اکٹھا نہ ہو سکا۔ جہاں جہاں سے اُمید تھی وہاں سے بھی میرے ہر استفسار کا جواب عذرِ لاعلمی میں دیا گیا۔ ہر سعی ناکام ہوئی۔ غرض حوصلے پست ہو گئے۔ جی چھوٹ گیا اور اس تاریکی میں راہروی، دوسروں کا کیا ذکر ہے، خود میرے نزدیک بھی شیخ چلّی کے منصوبے سے کچھ زاید نہ معلوم ہوئی۔ بس مَیں ہمّت ہار کر بیٹھنے والا ہی تھا کہ ایک کرم فرما کی مہربانی سے رام چند شُکل کی "جائسی گرنتھاولی" ہاتھ لگی جس میں ملک صاحب کے حالات کے ساتھ ساتھ اُن کی دو کتابیں "پدماوت" اور "اکھراوٹ" بھی تھیں ـــــ مُردہ امیدیں جان آگئی گویا اندھے کو دو آنکھیں مل گئیں اگرچہ یہ کتاب ہندی رسم الخط میں تھی پھر بھی احبا کی مدد سے مَیں نے اُس کے اقتباس رسالۂ تسنیم آگرہ میں شایع کرنے شروع کیے۔

اگرچہ اہلِ وطن نے گرمجوشی کا اظہار نہ کیا لیکن مجھے تو ایک پگ ڈنڈی مل ہی چکی تھی۔ مَیں نے یہ خیال کر کے کہ اب کہیں سے کچھ اور تو ملے گا نہیں "جائسی گرنتھاولی" ہی کو شمع راہ بنا کر اسی کا غایر مطالعہ شروع کیا اور پدماوت کے ایک ایسے نسخے کی جستجو میں لگا رہا جو اُردو رسم الخط میں ہو

مگر یہ نہ آج ملتا تھا نہ کل —— بارے شیخ نعمت اللہ صاحب جائسی کی بدولت میری مراد بر آئی - پدماوت کا ایک حسب دلخواہ نسخہ ملا اور اُس وقت ملا جب بغیر اس کے کام چل ہی نہ سکتا تھا۔ دو اور کتابیں "آخری کلام" مصنّفۂ ملک صاحب اور شاہ سیّد علی نقی صاحب جائسی کی تصنیف کردہ ایک تاریخ جو خانوادۂ پیرزادگان جائس کے حالات میں ہے انھیں کی کوششوں سے ملیں جن سے ملک صاحب کے متعلق کافی معلومات حاصل ہوئیں۔ یہی نہیں بلکہ شیخ صاحب نے ملک صاحب کا شجرۂ نسب اور ان کے دوستوں کے متعلق بھی کارآمد اطلاعات مہیّا فرمائیں۔ اب گویا مہر سکوت ٹوٹی اور مجھے بے مانگے مدد ملنے لگی۔ اکثر حضرات نے اپنے ذخیرۂ معلومات سے مجھے کچھ نہ کچھ مرحمت فرمایا وہ بدیر سہی —— گو نعمت اللہ صاحب کی امداد کے بعد مجھے کسی صاحب کی معلومات سے کوئی مزید فایدہ نہیں ہوا - پھر بھی میں اُن حضرات کا شکر گزار ہوں۔

اسی درمیان میں یہ بھی معلوم ہوا کہ ملک صاحب کا نانہال مانکپور (ضلع پرتاب گڑھ اودھ) ہے مگر وہاں تو اُنھیں کوئی جانتا بھی نہیں —— دنیا اپنے نامور فرزندوں کو کس قدر جلد فراموش کر دیتی ہے!!

الہ آباد یونیورسٹی کے ادبی قانونی اور تجارتی شعبہ جات تحقیق کی سال بھر کی کارگزاریاں رسالے کی صورت میں الہ آباد اسٹڈیز (ALLAHABAD STUDIES) کے نام سے شایع ہوتی ہیں اس کی جلد ۶ (حصّہ اوّل) بابت ۱۹۳۲ء میں بھی ایک مضمون انگریزی میں ملک محمد جائسی کے متعلق رائے بہادر لالہ سیتارام صاحب (بی۔اے) کا (صفحہ ۳۲۳-۳۴۷) میری نگاہ سے گزرا مگر مطالعے سے معلوم ہوا کہ اس مضمون کا ماخذ وہی

شاہ سیّد علی نقی کی تاریخ ہی اور کچھ زبانی اخبار ـــــ اس مضمون کی نشاندہی جناب چندربلی صاحب پانڈے ایم اے بنارس ہندو یونیورسٹی نے فرمائی تھی موصوف اُن مسلمان ہندی شعرا کے متعلق ایک مقالہ سپردِ قلم فرما رہے ہیں جنھوں نے ہندی ادب میں تصوّف کا رنگ بھرا ہی۔ مجھے اس سلسلے سے نیاز حاصل ہوا کہ موصوف کو ملک محمد جائسی کے متعلق لکھنے کے لیے اُن کی ایک کمیاب تصنیف یعنی "آخری کلام" کی تلاش تھی اور یہ ان کو میرے پاس سے ملی ۔ اسے پنڈت جی مجھ سے لے گئے اور "جائسی گرنتھاولی" کی اشاعت حالیہ میں اس کو شامل کر دیا۔

پانڈے جی صحیح معنوں میں طالب علم ہیں اور تحقیق و تدقیق کے دلدادہ۔ ادب دوست بھی ہیں اور ادب نواز بھی۔ اُنھوں نے میری بہت عزّت افزائی فرمائی اور اپنی اُن تصانیف سے جو اُنھوں نے ملک صاحب کے متعلق کی ہیں مُستفید فرمانے کا وعدہ کیا۔ موصوف کے جو مضامین مجھے اب تک ملے اُن میں زیادہ تر پدماوت کے رسم الخط اور سال تصنیف کے متعلق بحث کی گئی ہی گو مجھے پنڈت جی کی بعض رایوں سے اختلاف ہی لیکن میں اُن کا ممنون ہوں۔

ان کے علاوہ "سدھاکر چندریکا" جو ڈاکٹر گری یرسن اور سدھاکر جی کی دماغ کاوی کا نتیجہ ہی اور جس کا دیباچہ اور ترجمہ انگریزی میں ہی مگر نامکمّل۔ اس کو اور نیز "خزینۃ الاصفیا" جو ۱۲۸۲ھ کی تصنیف ہی انھیں بھی دیکھا۔ "خزینۃ الاصفیا" کے مصنّف منشی غلام سرور مرحوم لاہوری ہیں۔ اور کانپور کے مطبع نولکشور میں طبع ہوئی ہی۔ اس کی جلد اوّل کے صفحہ ۳،۷،۴ پر ملک محمد جائسی کے متعلق کچھ تذکرہ فارسی زبان میں ہی۔

میں نے اپنے ماخذ بیان کر دیے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہی کہ باوجود امکانی تلاش کے ملک صاحب کے متعلق کوئی معتبر تاریخی ذریعہ حالات معلوم کرنے کا بہم نہیں پہنچ سکا اور اکثر روایات سینہ بہ سینہ پر قناعت کرنی پڑتی ہی یا پھر ملک صاحب ہی کی کتاب سے استنباط کیا جا سکتا ہی۔ گویہ دونوں ماخذ ملک صاحب کے متعلق صحیح حالات کے انکشاف کے لیے کافی نہیں لیکن چارہ کار ہی کیا تھا۔ بہرصورت ان ذرایع سے جو نقد معلومات حاصل ہو سکی اور قراین کی کسوٹی پر کھوٹی ثابت نہ ہوئی وہ اس کتاب میں ملے گی۔

ملک صاحب کے رجحان طبع، استعداد، اُن کے تعلقات اور اُن کے دیگر حالات زندگی کے متعلق جو کچھ بھی معلوم ہو سکتا تھا وہ سب میں نے فراہم کر کے پیش کر دیا۔ بس یہی ہی میری کاوش اور جستجو کا نتیجہ۔

سید کلب مصطفےٰ

۱- حالاتِ زندگی

عہدِ ملک محمد جائسی میں ہندستان کی فضا

محمد قاسم کے سندھ پر حملہ کرنے اور امیر خسرو کے پٹیالی (ضلع ایٹہ) میں پیدا ہونے کی مدّت چھ سو سال کے لگ بھگ ہے۔ جہاں دنیا کی تغیّر پزیری کا تعلق ہے چھ سو سال کیا صرف چھ سال بہت ہوتے ہیں لیکن تمدّن اور معاشرت میں انقلاب کے لیے اتنا زمانہ بہت کم سمجھا جاتا ہے خاصکر اس وقت جبکہ تعلّقات قایم کرنے میں صرف اجنبیت ہی حایل نہ ہو بلکہ فاتح اور مفتوح کا فرق بھی موجود ہو۔ لیکن ہندستان میں جن تبدیلیوں نے اس قلیل مدّت میں رؤنما ہوکر ہندو اور مسلمانوں کے تعلّقاتِ باہمی کو معاشرت اور تمدّن کے اعتبار سے شیر و شکر کا مصداق بنا دیا وہ اس خیال کی تردید کرتی ہیں۔ اب ان خوشگوار تعلّقات کی ذمہ دار مسلمانوں کی رواداری ہو یا ہندوؤں کی مہماں نوازی یا یہ دونوں لیکن واقعہ یہی ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمانوں کو آئے ابھی چند روز ہوئے تھے کہ ہندوؤں سے برادرانہ مراسم قایم ہوگئے اور کچھ ذریعے ایسے پیدا ہوئے کہ بالآخر ہندستان اُن کا وطن بن گیا۔

یہ بین الاقوامی تعلّقات یہیں تک محدود نہ تھے بلکہ خلفائے عرب کے درباروں میں ہندستان کے علما اور پنڈتوں کی شمعِ علم اُسی طرح روشن تھی جس طرح مسلمان شاعر اور ادیب سرزمینِ ہند کو سرچشمہ ہائے علوم سے سیراب کر رہے تھے۔ امیر خسرو نے خالق باری تصنیف کرکے اُن گہرے تعلّقات کا ثبوت دیا جو اُس وقت قایم ہوچکے تھے۔ ثبوت ہی نہیں دیا بلکہ ان میں استحکام پیدا کیا حتیٰ کہ زمانہ آگیا کہ عوام "رام اور رحیم" کو ایک ماننے

اور خدا خدا کرنے کو رام رام کہنے کا مرادف جاننے لگے۔ سادھو اور فقیروں کو دونوں مذہب کے لوگ عزّت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ سادھو اور فقیر بھی وہی سمجھے جاتے تھے جو تعصّب سے دور یگانگی اور رواداری کے وسیع سمندر کی تھاہ تک پہنچے ہوئے تھے۔ بہت دنوں ایک ساتھ رہتے رہتے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ کُھلے دل سے زندگی بسر کرنے لگے تھے اور لوگوں کے دلوں اور خیالوں پر افتراق کے بجائے اتحاد کا جذبہ غالب تھا مسلمان ہندوؤں کی رام کہانیاں سنتے تھے اور ہندو مسلمانوں کے ترانہائے حمد و نعت۔ نل اور دمینتی کی پریم کہانی سے مسلمان لُطف اندوز ہوتے تھے اور لیلیٰ مجنوں کی داستان محبّت سُن کر ہندو اپنا دل بہلاتے تھے۔ ہندو مہاتما اور مسلمان صوفی "بھگوت پریم" اور "عشقِ حقیقی" کے سبق دے ہی چکے تھے اب کیا تھا تعلّقات قایم ہونے کے بعد "گیان" اور "معرفت الٰہی" کی منزلیں بھی ساتھ ہی ساتھ طے ہونے لگیں۔ ایسے وقت میں مسلمانوں کا ہندوؤں کی گھریلو روایات سے دلچسپی لینا اور اُنھیں تصنیف کا جامہ پہنانا اور بھی سونے پر سہاگے کا کام کر گیا۔ ان کہانیوں کو بیان کر کے مسلمانوں نے جتا دیا کہ دل کا وجود نہ کسی مذہب سے وابستہ ہے اور نہ جذبات محبّت ملک و ملّت کی قیود میں محدود ہیں یعنی جو باتیں ایک کے رنج و خوشی کا باعث ہیں وہی دوسرے کی، جن تاثرات سے ایک کا دل متاثر ہوتا ہے اُنھیں سے دوسرے کا بھی۔ غم میں غم ہوتا ہے اور خوشی میں خوشی۔

ترکی ، عربی ، ہندوئی ، بھاشا جیتی آہ

جیھ منھ مارگ پریم کر بُر سراہیں تاہ

ترجمہ۔ ترکی، عربی، ہندی، جتنی زبانیں ہیں، اُن میں سب اُسی زبان کو سراہتے ہیں جس میں محبت کی طرف رہنمائی کی گئی ہو۔

तुर्की, अरबी, हिंदुई, भाषा जेती आहि।
जेहि मँह मारग प्रेम कर, सबै सराहैं ताहि॥

اشتراک جذبات کا یہ خیال جو عوام کے دلوں میں امیر خسرو قطبیں میاں اور شاعر جائسی کی بدولت راسخ ہو گیا تھا اُسے سکندر لودی اور علاؤالدین ایسے بادشاہوں کا تشدد بھی نہ مٹا سکا اور جیسے کا تیسا بنا رہا — ایک طرف تو سکندر لودی متھرا کے مندروں کو گرا کر مسجدیں کھڑی کر رہا تھا، کشمیر کے معابد منہدم کرا رہا تھا اور ہندوؤں پر طرح طرح کے ظلم توڑ رہا تھا اور دوسری طرف پورب میں شیر شاہ کے والد حسین[1] شاہ کی سرپرستی میں قطبیں[2] ایک ایسی نظم بے کرائے جس میں مذاہب کے افتراق سے کوسوں دور انسانیت اور محبت کی جھلک آ رہی تھی اور جو پکار پکار کر کہہ رہی تھی۔ کہ "الناس علیٰ دین ملوکھم" کا اصول ہرگز اٹل نہیں — قطبین[3] کے علاوہ دوسرے مسلمانوں نے بھی اس قسم کی پانچ اور "پریم کہانیاں" اسی

---

[1] تاریخوں میں ان کا نام حسن ملتا ہے۔ جنھیں سہسرام اور خواص پور جاگیریں ملی تھیں۔

[2] قطبیں چشتی خاندان کے ایک بزرگ شیخ بُرہان کے شاگرد تھے اُنھوں نے "مرگاوتی" نام کی ایک نظم ۹۰۶ھ ۱۲۱۰ء میں لکھی اس میں چندر نگر کے راجہ گن پت دیو کے بیٹے (ولی عہد) اور کنچن نگر کے راجہ روپ مرار کی لڑکی مرگاوتی کے محبت کی داستان لکھی ہے۔

[3] ملک محمد جائسی نے اپنے زمانے سے قبل لکھی ہوئی چھ نظموں کا ذکر یوں کیا ہے۔

وکرم دھنسا پریم کے بارا
سپناوت کنھ گیو پتارا

विक्रम धँसा प्रेम के बारा।
सपना वति कहँ गयउ पतारा॥

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶ پر ملاحظہ کیجیے

زمانے کے لگ بھگ لکھ کر بے تعصبی اور رواداری کی تعلیم دی۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳

مدھو پاچھے مُگو دھاوت[2] لاگی	मधु पाछे मुगु धावति लागी।
گگن پورا ہوئے گا بیراگی	गगनपुरा होइगा बैरागी ॥
راج کنور کنچن پور گیو	राजकुँवर कंचन पुर गयऊ।
مِرگاوتی[3] لنھ جوگی بھیو	मिगावती कहँ जोगी भयऊ ॥
سادھ کنور کھنڈاوت جوگو	साध कुँवर खँडावत जोगू।
مدھو مالت[4] کر کینھ بیوگو	मधु मालति कर कीन्ह बियोगू ॥
پریاوت[5] کنھ سُر سر سادھا	प्रेमावति कहँ सुरसरि साधा।
اُوشا لگ[6] اِن رُدھ بر باندھا	ऊषा लगि अनिरूध बर बाँधा ॥
(پدماوت)	(पदमावत)

"وکرم دت[1]" اور "اُشا اَنی رُدھ[2]" کی مشہور کہانیوں کے علاوہ جو اور چار عشق کی داستانیں ملک محمد جائسی کے پہلے لکھی گئی ہیں اُن میں سے "مرگاوتی[3]" اور "مدھو مالتی[4]" تو مل گئی ہیں لیکن "پریاوت[5]" اور "مُگدھاوتی[2]" کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ملک محمد نے "پدماوت" انھیں نظموں کے طرز پر لکھی ہے ان کے بعد بھی اس قسم کی نظموں کے لکھنے کا رواج رہا چنانچہ غازی پور کے رہنے والے ایک بزرگ شیخ حسین کے صاحبزادے عثمان (رمان) نے سمت ۱۶۷۰ کے لگ بھگ "چتراولی" لکھی جس میں نیپال کے راجا دھرنی دھر کے لڑکے سُبحان اور روپ نگر کے راجا چتر سین کی لڑکی چتراولی کی محبت کا ذکر ہے مثل دوسری نظموں کے زبان اودھی ہے کچھ بھوجپوری کا بھی میل ہے۔ اسی قسم کی ایک دوسری کتاب نور محمد کی "اندراوت" ہے جو سمت ۱۸۰۶ بکرمی میں لکھی گئی تھی۔ اس سلسلے میں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ اس قسم کی تمام پریم کہانیوں کے مصنف مسلمان تھے جنھوں نے ان کو مثنوی کے طرز پر اور اودھی زبان میں لکھا تھا۔

ملک محمد کا مولد و مسکن

خوش قسمتی سے ملک محمد بھی ایسے ہی زمانے میں جبکہ ہندو اور مسلمان بالکل گھُلے مِلے تھے قصبۂ جائس[۱] میں محمد ظہیر الدین بابر شاہ کے عہد میں سنہ ۹۰۰ھ ۱۴۹۵ء میں پیدا ہوئے ملک صاحب نے اپنی پیدائش اور وطن دونوں کا ذکر اپنی ایک تصنیف میں اس طرح فرمایا ہے۔

بھا اوتار مور نو صدی | भा औतार मोर नौ सदी ।

(آخری کلام) | (आख़िरी कलाम)

جائس نگر مور استھانو | जायस नगर मोर असथानू ।
نگر کے ناؤں آدی اُدیانو | नगर के नाँव आदि उदयानू ॥

(آخری کلام) | (आख़िरी कलाम)

ملک جی نے اپنے وطن کو ایک دوسرے مقام پر "دھرم استھان" بتایا ہے جس سے جائس کی طرف سے ملک صاحب کے دل میں حب وطن کا جذبہ بدیہی طور پر ثابت ہوتا ہے۔

جائس نگر دھرم استھانو | जायस नगर धर्म असथानू ।

(پدماوت) | (पद्मावत)

مندرجہ بالا شعر کا حوالہ دینے کے بعد ملک صاحب کی حب الوطنی کا

---

[۱] اس قصبہ (جائس) کے نامی آدمیوں میں ملک محمد جائسی کا نام آتا ہے جس نے شیر شاہ کے عہد میں پدمات تصنیف کی، وہ مخدوم اشرف کا چیلا تھا۔

(ڈسٹرکٹ گزیٹر۔ جلد ۳۹۔ رائے بریلی۔ صفحہ ۱۸۳)

جائس ملک محمد جائسی کا موطن ہونے کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہ سولھویں صدی میں گزرا ہے اس کی ہندی تصنیف پدماوت مشہور ہے۔

(امپیریل گزیٹر جلد ۱۳۔ اشاعت جدید صفحہ ۹۰۲)

ذکر کر کے خاموش ہو جانا اُن کے وطن کی گونہ حق تلفی ہے اس لیے ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ جائس کے اُن حالات پر روشنی ڈالی جائے جن کی بنا پر ملک صاحب نے جائس کو "دھرم استھان" کہا ہے۔

فاتح جائس سید نجم الدین خود ایک ایسے مقدّس بزرگ تھے جو اکثر تلواروں کی چھانوں میں طاعتِ حق بجالاتے تھے —— یہ تلوار کی چھانو ہی کہلاتی ہے کہ ایک طرف اجنبی ملک میں گھمسان لڑائی ہو رہی ہو اور دوسری طرف لشکر کا سردار مشغول عبادت گزاری ہو —— کم و بیش انھیں خصوصیات کی حامل نسلیں ملک محمد کے زمانے میں بھی موجود تھیں اور یہی وجہ ہے کہ شاعر جائسی نے اپنے وطن جائس کو "دھرم استھان" کہا —— حقیقت میں وہ عہد پاک تھا بھی ایسا ہی جس کی آغوش میں سیّد اشرف جہانگیر اور مبارک شاہ بودلے ایسے برگزیدگانِ خدا موجود تھے جن کے فیوض باطن سے ملک محمد جائسی کو تصوّف اور خدا پرستی میں وہ مراتب حاصل ہو سکے جس کا تصوّر گویا اُن کے نام کا جزو بن گیا۔

تغیّرات زمانہ کے کرشمے ارباب نظر کے لیے محتاج بیان نہیں۔ فتحِ جائس کے بعد آج جائس کی آبادی کو ساڑھے نو سو برس کا زمانہ گزر چکا اور جبکہ ؎

ہر لحظہ ہر ساعت ہر دم   دگر گوں میشود احوال عالم

تو پھر ساڑھے نو سو برس میں تو اتنے لحظے اتنی ساعتیں اور اتنی سانسیں شامل ہیں کہ ان کے شمار پر بہترین محاسب بھی قدرت نہیں رکھتا اسی نسبت سے تغیّرات بھی بے شمار ہو چکے ہیں اس لیے آج کے جائس پر ملک محمد کے عہد کے جائس کا قیاس کرنا محض بے معنی ہوگا۔

ریلوے اسٹیشن جائس رائے بریلی اور پرتاب گڈھ کے درمیان قصبے
کی آبادی سے تقریباً ۲ میل کے فاصلے پر واقع ہی اسی قصبے کے ایک محلّے
میں جو کنچانے کے نام سے مشہور ہی۔ ملک محمد کا مکان اب تک موجود ہی جس
کی بوسیدگی اور شکستہ حالی زبان حال سے ہندستانیوں کی غفلت اور بے حسی
کا نوحہ پڑھتی ہوئی نظر آتی ہیں ـــ کاش شاعر جائسی انگلستان میں ہوتے
جہاں شیکسپیر کے مکان کو گویا معبد کا مرتبہ دیا جاتا ہی!!
ملک جی کی پیدائش کے وقت سخت زلزلہ[1] بھی آیا تھا۔ اس کا ذکر

[1] آوت اُدھت چار بدھ ٹھانا	आवत उधत-चार विधि ठाना ।
بھا بھوکنپ جگت اکولانا	भा भू कँप जगत अकुलाना ॥
دھرتی دینھ چکر بدھ بھائیں	धरती दीन्ह चक्र विधि भाइँ ।
پھری کاس رہٹ کے نائیں	फिरै अकास रँहट कै नाइँ ॥
گرے پہاڑ مودن تس ہالا	गिरि पहाड़ मोदनि तस हाला ।
جس چالا چلنی بھر چالا	जस चाला चलनी भरि चाला ॥
مرت لوک جیون رچا ہنڈولا	मिरित-लोक ज्यों रचा हिंडोला ।
سرگ پتال پون کھٹ ڈولا	सरग पताल पवन खट डोला ॥
گر پہاڑ پربت ہل گیئے	गिरि पहाड़ परवत ढिल गए ।
سات سمندر کیچ مل گیئے	सात समुद्र कीच मिल गए ॥
دھرتی پھاٹ، چھات بھہرانی	धरती फाटि, छात भहरानी ।
پُن بھئی میا جو سشٹ ڈٹھانی	पुनि भई मया जु सिष्टि दिठानी ॥
جو اس کھمبھنہ پائے کے سہس جیبھ گہرائیں	जोअस खँभन्ह पाइ कै,सहस जीभ गहिराइँ
سو اس کینھ محمد تو ہی اس بپورے کائیں	सोअस कीन्ह मुहम्मद तोहि अंस बपुरे काइँ॥

(آخری کلام) (आख़िरी कलाम)

ملک صاحب موصوف نے خود ہی فرمایا ہے۔

خاندان شاعر جائسی کے بزرگ عربی نسل سے تھے۔ جو حسب اور نسب کے اعتبار سے خاص امتیاز رکھتے تھے اُن کے والد کا نام شیخ ممریز[1] تھا۔ ماں کا نام معلوم نہیں اتنا معلوم ہے کہ اُن کی نانہال مانکپور میں تھی اور شیخ اللہ داد اُن کے نانا تھے۔

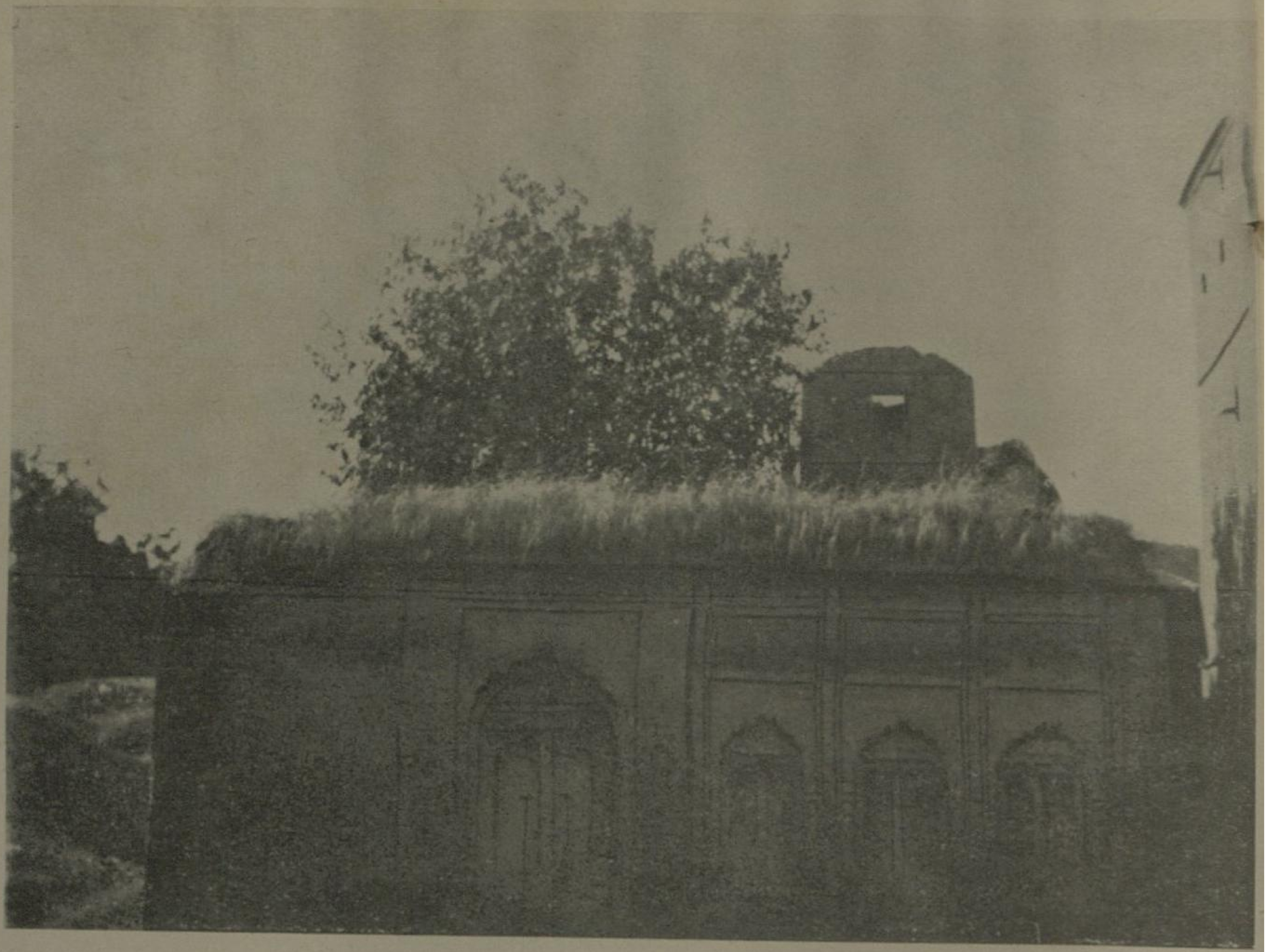
حلیہ ابھی سات ہی برس کے تھے کہ شدّت کے ساتھ چیچک نکلی بچنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ ماں نے مَنّت مانی کہ صحت ہونے پر مکن پور میں مدار شاہ[2] کی زیارت کروں گی —— اچھے تو ہو گئے۔ اچھے کیا ہوئے گویا پھر سے پیدا ہوئے لیکن ایک آنکھ جاتی رہی اور بہت بدصورت ہو گئے ان کی بدصورتی کے متعلق ایک قصہ بہت مشہور ہے جس سے اُن کی

[1] ملک محمد جائسی کا شجرۂ نسب حسب ذیل ہے۔

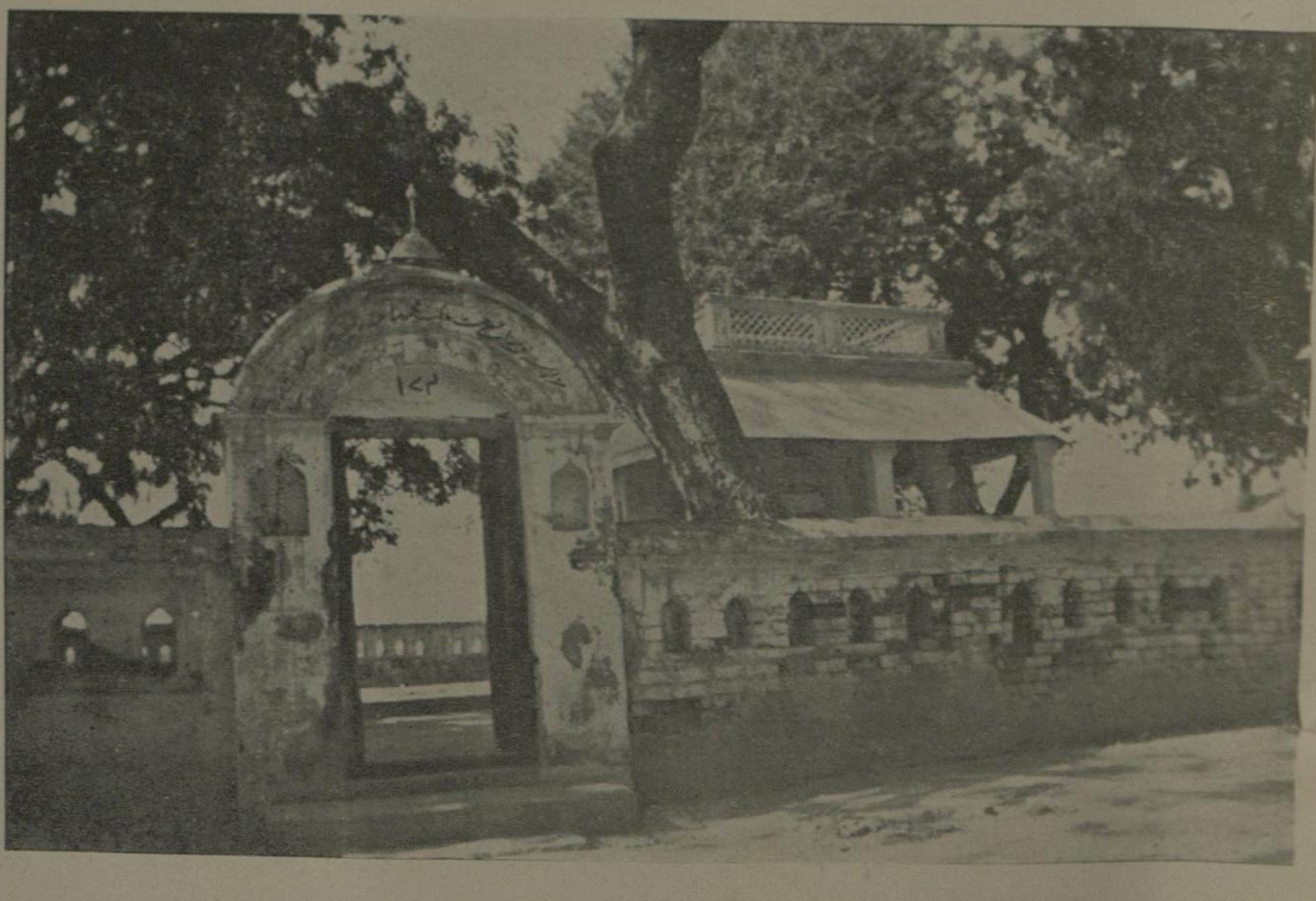
شیخ محمد علی ملک
ملک شیخ حبیب اللہ
ملک شیخ محمد فاضل
ملک شیخ محمد نعیم
ملک شیخ عبد الجلیل
ملک شیخ جمال الدین
ملک شیخ محمد اسحٰق
ملک شیخ منگرے
ملک شیخ جانعالم
ملک شیخ مجیب اللہ
ملک شیخ سلطان
ملک شیخ محمود
ملک شیخ جن
ملک شیخ ممریز —— ملک شیخ فیروز

شیخ ملک حافظ — ملک شیخ مظفر (لاولد) — ملک شیخ مصفی (ملک محمد جائسی) (لاولد)

[2] حاشیہ صفحہ ۲۱ پر ملاحظہ کیجیے



ملک محمد جایسی کا مسکن
واقع محلہ کنچانہ، جایس (اودھ)



ملک محمد جایسی کا مزار
واقع قصبہ امیٹھی، ضلع سلطان پور (اودھ)

حاضر جوابی اور سنجیدگی پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک مرتبہ شیر شاہ کے دربار کا کوئی امیر (بہ روایتےہا[1] اکبر بادشاہ) جو ان کو پہچانتا نہ تھا اُن کے بدصورت چہرے کو دیکھ کر ہنسا تو اُنھوں نے کمال متانت و سنجیدگی سے پوچھا کہ "مٹیا ہنسیو کہ کُمھرا" یعنی مٹّی کا مضحکہ کرتے ہو کہ کمہار کا یہ سُن کر وہ بہت شرمندہ ہوا اور ان کا نام پوچھ کر معافی مانگی اسی واقعے کو میر حسن[2] دہلوی نے نظم کیا ہے۔

حاشیہ صفحہ ۱۸ ع۔۲

مدار شاہ کب ہوئے ہیں معلوم نہیں البتہ آئین اکبری میں اُن کے متعلق حسب ذیل سطریں پائی جاتی ہیں جن سے اُن کے متعلق کچھ علم حاصل ہو سکتا ہے۔

"لقب او بدیع الدین کہ در ہندی بوم بدو گردد دوالاپاگی او بگزارد۔ گویند مرید شیخ طیفوری نظامی است۔ ہرگز جامۂ او شوخ گُن نہ شدے وباخلق نہ آمیختے۔ بروز دوشنبہ درِ خلوت آگاہِ او کشادہ گشتے و فراواں حاجت خواہ فراہم آمدے آئین چناں بود کہ چوں مردم از آمدن باز ماندے۔ داستاں برسرایندے دراں میاں جوئندگان را باسخ آمادہ شدے ہر کہ جواب خود شنیدے نیایش کناں برخواستے و شگرف داستانہا از او برگزارند و سلسلۂ مداریہ را او سر آغاز

خوابگاہ مکن پور۔ و ہر سال روز فرو شدن او گروہا گروہ مردم از دور دست بہ آنجا رسند و ہر یکے رنگا رنگ علم باخود بردہ نیایش ہا بجا آورد

[1] خزینۃ الاصفیا در سالہ شیخ عبدالقادر جائسی

(نوٹ) خانوادہ جائس مرتبہ شاہ سید علی نقی صاحب میں یہ روایت ایک راجا سے منسوب ہے۔

[2] رموز العارفین مصنفہ میر حسن دہلوی (غیر مطبوعہ) ملاحظہ ہو "تعارف"۔

ملک صاحب نے اپنے یک چشم ہونے کا ذکر خود اپنی تصانیف میں کیا ہی۔ پدماوت میں ایک مقام پر فرماتے ہیں۔

اک نین کوی محمد گُنی ۔ एक नयेन कवि मुहम्मद गुनी ।

ترجمہ۔ میں محمد ایک چشم شاعر باکمال ہوں۔

اُسی نظم میں دوسرے مقام پر فرماتے ہیں۔

محمد بائیں دسا تجا اک سرون اک آنکھ

मुहम्मद बाईं दिसा तजा ॥
एक सरवन एक आंख ।

ترجمہ۔ محمد (ملک محمد) کے بایاں کان اور بائیں آنکھ نہ تھی۔

اس سے معلوم ہوتا ہی کہ چیچک میں اُن کی بائیں آنکھ جاتی رہی تھی اور بائیں کان سے بہرے ہوگئے تھے۔ ملک لولے لنگڑے اور کوزہ پُشت بھی تھے۔

بہر حال ماں کے لیے اُن کا جی بچنا ہی بہت نعمت تھی مگر افسوس کہ منت اُتارنے سے پہلے ہی ماں کا انتقال ہوگیا۔

باپ پہلے ہی وفات پا چُکے تھے یتیم اور بے والی ووارث ہوکر سادھوؤں فقیروں کے ساتھ رہنے لگے۔ انھیں لوگوں کی صحبت کا اثر ہوا کہ یہ بھی بڑے درویشوں میں سمجھے جانے لگے اور دراصل تھے بھی ایسے ہی۔

خطاب ملک ایک عربی لفظ ہی جو اپنے مترادف شاہ کی طرح عموماً بادشا کے معنوں میں استعمال ہوتا ہی۔ حکومت مصر میں یہ خطاب تھا وزیر اعظم اور سپہ سالار کا۔ خلجی بادشاہوں کے زمانے میں اس لفظ سے نوابوں کو مخاطب کرتے تھے جب علاؤالدین نے اپنے چچا کو قتل کرنے کے لیے بہت سے "ملکوں" کو مقرر کیا تو یہ لفظ بہت اہم ہوگیا۔

تاریخ فیروز شاہی میں تحریر ہے کہ "ملک بارہ سواروں[۱] کے افسر کو کہتے ہیں۔ ایک جگہ نظر سے گزرا ہے کہ "ملک اُس سردار کو کہتے ہیں جس کے پاس دس ہزار سوار ہوں اور ولایت یعنی ایران میں ملک زمیندار کو کہتے ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ گونڈہ اور فیض آباد کے ضلعوں کے اہیر[۲] بھی اسی نام سے مشہور ہیں۔

بہر حال لفظ ملک کے جو معنی بھی لیے جائیں خود شاعر جائسی کے مشاغل اور رجحان طبیعت کے اعتبار سے ان کے نام کے ساتھ اس لفظ کا شامل ہونا کسی قدر تعجب خیز ضرور معلوم ہوتا ہے لیکن حیرت اُنھیں لوگوں کو ہو سکتی ہے جو شاعر جائسی کے خاندانی وقار اور وجاہت سے ناآشنا ہیں ورنہ یہ ایک کھُلی ہوئی بات ہے کہ شاعر جائسی کے بزرگ عرصے سے ملک کے خطاب سے سرفراز چلے آتے ہیں بلکہ یوں کہیے کہ اُن کے

۱؎ "و بعضے نوشتہ کہ ملک بفتح میم وکسر لام بزمانۂ قدیم امیر ایز می گفتند"
(غیاث اللُّغات مطبوعہ مطبع نول کشور ۱۸۶۷ء)

۲؎ بھوجپور اور غازی پور کے راجا جگت دیو (۱۵۲۷-۷۳ء) (جو شیر شاہ کے دوست تھے اور بکسر کی اُس لڑائی میں موجود تھے جس میں شیر شاہ نے ہمایوں کو شکست دی تھی) کے یہاں گندھرو رائے نام ایک مشہور گویا تھا جس سے ملک محمد کو بہت اُنس تھا اُنھوں نے گندھرو رائے کو دعا دی تھی کہ تمھارے خاندان میں فنِ موسیقی ہمیشہ رہے گا بشرطیکہ ہماری محبت کی یادگار کے طور پر تم اپنے خاندان کے ناموں کے ساتھ لفظ "ملک" لگا دو۔ تب سے گندھرو رائے کے خاندان کے لوگ (جو اب تک بلیا ضلع کے رائے بُرا اور ہلدی کے علاقوں میں رہتے ہیں) ملک کہلاتے ہیں اور مشہور گویے ہیں۔

جدّاعلیٰ شیخ محمد علی نے جب غازی ابوالقاسم کے ساتھ ہندستان میں قدم رکھا تو اس وقت بھی وہ ملک کہلاتے تھے اور یہ خطاب اب تک اُن کے خاندان میں نسلاً بعد نسلٍ برابر چلا آرہا ہے۔

لقب ملک صاحب کا لقب محقق ہندی[1] ہے اور اُن کو شیخ شہید بھی کہتے ہیں۔

ذریعۂ معاش شاعر جائسی کا ذریعۂ معاش زراعت تھا۔ چند بیگھے آبائی زمین تھی۔ جوت بو کر بسر اوقات کرتے تھے۔

اولاد یہ تو سب جانتے ہیں کہ ملک صاحب دنیا سے لاولد اُٹھے اور یہ بھی اکثر حضرات کو معلوم ہے کہ اُن کے سات بیٹے تھے اُن ساتوں کے انتقال کے متعلق مختلف روایتیں ہیں لیکن اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ سب بہ یک وقت ضایع ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ملک صاحب کو اس کا جو صدمہ بھی ہوا ہو وہ کم ہے لیکن اس سانحے کی جو وجہ اہل عقیدت بتاتے ہیں اس کو اگر صحیح مان لیا جائے تو ملک صاحب کا صدمہ اور بھی عظیم ٹھہرتا ہے۔

روایت ہے کہ ان کے پیر سیّد شاہ مبارک بودلے حکیموں کی تجویز سے پوستے کا پانی استعمال فرماتے تھے کہ بھوک کم لگے اور نیند کم آئے۔ ملک صاحب نے بوجہ اُس شوخی اور ظرافت کے جو فطرت نے انھیں عطا فرمائی تھی ایک رسالہ تصنیف کیا۔ نظم میں جس کا نام "پوستی نامہ" رکھا اور اس میں چند شعر پوستے کی مذمت میں بھی شامل کر دیے جو اُن کے پیر کو پسند نہ آئے اور انھوں نے غصے میں فرمایا کہ "دُر نپوتے" کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ تیرا

---

[1] ماخوذ از خزینۃ الاصفیا جلد اوّل صفحہ ۳۰۷ (مصنفہ منشی غلام سرور صاحب مرحوم لاہوری)

پیر پوستی ہی۔" مبارک شاہ کو یہ کہے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ خبر آئی کہ اُن کے ساتوں[1] لڑکے جو ایک جگہ کھانا کھا رہے تھے چھت کے نیچے دب کر مر گئے۔

شاہ صاحب کو افسوس ہوا اور اُنھوں نے دعا کے طور پر پیشینگوئی کی کہ سات لڑکوں کے عوض تمھاری چودہ تصانیف قیامت تک بطور یادگار باقی رہیں گی۔ یہ سُن کر ملک صاحب کو فی الجملہ تسکین ہو گئی۔

احباب پدماوت کے شروع[2] میں ملک صاحب نے اپنے چار دوستوں کے نام لکھے ہیں ـــ ۱۔ یوسف ملک۔ ۲۔ سالار خادم۔ ۳۔ سلونے میاں۔ ۴۔ بڑے شیخ ـــ اور ان کے اوصاف بھی بیان کیے ہیں۔ یوسف ملک کو عالمِ کامل، صاحبِ فیض اور راز دار سخن بتایا ہی۔ سالار خادم کو صاحبِ فراست، شمشیر زن اور بہادر کہا ہی۔ میاں سلونے کی تعریف شیر دل اور شُجاع کہہ کر کی ہی۔ اور شیخ بڑے کو ستودہ صفت اور کامل فقیر قرار دیا ہی۔ ساتھ ہی ساتھ سبھوں کو درویش بھی ظاہر کیا ہی۔

---

[1] کچھ لوگ اس واقعے کو یوں بیان کرتے ہیں کہ شاہ صاحب نے یہ سُن کر ملک صاحب سے دریافت کیا کہ تم کیا چاہتے ہو۔ تمھارے لڑکے زندہ ہو جائیں یا تمھارا نام تمھاری تصنیف کی بدولت قیامت تک زندہ رہے۔ ملک صاحب نے فرمایا سب کچھ خدا کے اختیار میں ہی لیکن آپ یہی دعا فرمائیے کہ فرزندوں سے نہ سہی کتابوں ہی کے ذریعے سے نام باقی رہے۔

[2] حاشیہ صفحہ ۲۴ پر ملاحظہ کیجیے

۱۔ ملک یوسف ۲۔ سالار خادم ۳۔ شیخ بڑے	عہد ملک محمد جائسی میں اِن ناموں کے شرفا کا ذکر جائس کے شجروں اور وہاں کے پرانے کاغذات میں پایا جاتا ہی لیکن اس کے علاوہ ان لوگوں کے

حاشیہ صفحہ ۲۳

احباب کے متعلق ملک صاحب نے پدماوت میں حسب ذیل چوپائی لکھی ہی۔

ترجمہ} محمد شاعر نے چار دوست پائے جنھوں نے دوستی کو انتہا تک پہنچا دیا۔	چار میت کب محمد پائے جور متائی سر پہنچائے

चार मीत कवि मुहम्मद पाए।
जोरि मिताई सिर पहुंचाए ॥

ترجمہ} یوسف ملک جو عالم کامل اور صاحب فیض ہیں اولاً رازِ دل اُنھوں نے جانا۔	یوسف[۱] ملک پنڈت بہو گیانی پہلے بھید بات وے جانی

युसुफ मलिक पंडित बहु ज्ञानी।
पहिलै भेद बात वै जानी ॥

ترجمہ} پھر سالار خادم نے جو صاحب فراست ہیں اور جن کا ہاتھ شمشیر زنی اور سخاوت میں بلند رہتا ہی۔	پونہ سالار[۲] خادم مت ماہاں کھانڈے دان اُبھو نِت باہاں

पुनिहँ सालार खादिम मति माहां।
खांडे-दान उभै निति बाहां ॥

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷ پر ملاحظہ کیجیے

متعلق اور کوئی معلومات بہم نہیں پہنچ سکی۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴

میاں سلونے سنگھ بریارو
بیر کھیت رن کھڑگ جو جھارو

ترجمہ} تیسرے میاں سلو نے شیر کی طرح شجاع اور شمشیر زن ہیں۔

मियां सलोने सिंघ बरि यारू।
बीर खेत रन खड़ग जुझारू॥

شیخ بڑے بڑ سدھ بکھانا
کیے آدیس سدھ بڑ جانا

ترجمہ} شیخ بڑے۔ بڑے کامل اور ستودہ صفات ہیں کاملوں نے ان کی بزرگی تسلیم کی ہے۔

सेख बड़े बड सिद्ध बखाना। किए आदेस सिद्ध बड़ पाना॥

چاریو چترو سا گُن پڑھے
او سنجوگ گوسائیں گڑھے

ترجمہ} اُن چاروں کو اطراف عالم کے علم حاصل ہیں اور آپس میں بڑی محبت سے رہتے ہیں۔

चारिउ चतुर दसा गुन पढ़े।
ओ संजोग गोसाईं गढ़े॥

برکش ہوئے جو چندن باسا
چندن ہوئے بید تہی باسا

ترجمہ} جو درخت صندل کے پاس ہوتا ہے اس میں چندن کی سی خوشبو پیدا ہو جاتی ہے خواہ وہ بیدہی کا پیڑ کیوں نہ ہو۔

बिरिछ होइ जौ चन्दन पासा।
चन्दन होइ बेधि तेहि बासा॥

محمد چاریو میت مل بھئے۔ جو ایکے چت
ایہہ جگ ساتھے جو نبھا اُدہ جگ بچھرن کت

ترجمہ} محمد چار دوست مل کے جب ایک دل ہو گئے اور اس عالم میں نباہ ہو گیا تو پھر آخرت میں کیسے جُدا ہوں گے۔

मुहम्मद चारिउ मीत मिलि, भए जो एक चित्त।
एहि जग साथे जो निबहा, ओहि जग बिछुरन कित्त॥

۴۔ میاں[1] سلونے۔ شاہ مبارک بودے کے خلیفہ اور ملک محمد جائسی کے پیر بھائی تھے۔ سلسلہ نسب حضرت ایوب انصاری تک پہنچتا ہی۔ بڑے عالی منش، شجاع، بلند ہمت اور ریاضت پسند تھے ان کا مزار قصبۂ جائس میں دکھن کی جانب محلہ شیخانہ میں واقع ہی اور اُن کا اکھاڑہ پرانی کانجی ہوس کے قریب متصل بازار غفور گنج تھا۔ تارکُ الدّنیا اور لاولد تھے۔

---

[1] شجرۂ نسب میاں سلونہ

خواجہ ابوالشمس انصاری شیخ الاسلام
وفات نہم جمادی الثانی ۴۸۱ھ

ابراہیم ← ثابت شاہ ← منظر شاہ ← خواجہ ثابت علی
(جدِّ اعلیٰ انصار باقی جائس)

آتابک شاہ ← ابوالعاص ← محمود شاہ والیِ شیراز ← شیخ عبدالصمد
(مرید حضرت سلطان سید اشرف جہانگیر سمنانی)

شیخ محمد ← شیخ احمد ← شیخ محمد جلال ← شیخ عبدالقادر

شیخ شرف الدین، جلال الدین، بہاؤالدین، شیخ بدے، شیخ حسین، شیخ محمود

شیخ شرف الدین ← شیخ برخوردار ← شیخ سلونہ *

شیخ محمود ← قاضی شیخ بڑے *

* یہ دونوں نام اور جگہ بھی ملتے ہیں مثلاً شیخ بڑھا کا ذکر تو اس دستاویز میں بھی ہی جو شیخ اشرف (نعمت اللہ) نے ۱۲۲۳ھ میں تحریر کی ہی اور جس میں اپنا سلسلۂ نسب یوں درج کیا ہی

شیخ بڑھا ← فیض اللہ ← مبارک اللہ

نعمت اشرف ← برکت اللہ ← مبارک اللہ

ممکن ہی ملک صاحب والے شیخ بڑے یہی شیخ بڑھا ہوں۔ میاں سلونے سید نجم الدین فاتح جائس کی نسل میں بھی ایک بزرگ کا نام ہی۔

پُرانے کاغذات میں سے ایک کاغذ پر شیخ سلونہ کے دستخط حسب ذیل عبارت کے ساتھ ہیں "سلونہ برخوردار انصاری گواہ شد بخطہ"۔ ایک دوسری دستاویز پر "سلونہ برخوردار گواہ شد" لکھا ہوا ملتا ہے۔ یہ دونوں دستاویز شاہ محمد اشرف اشرفی جائسی کے یہاں موجود ہیں۔ اول الذکر کی تاریخ تحریر ۹۔ ربیع الثانی سنہ ۱۰۱۷ھ اور دوسرے کی تاریخ تحریر ۱۴۔ ربیع الثانی سنہ ۱۰۲۹ھ ہے

مذہب اتنا کہنے کے بعد کہ ملک صاحب ایک فقیر منش اور صوفی صفت بزرگ تھے اور اُنھوں نے اسلام کی گود میں پرورش پائی۔ اُن کے اعتقادات اور مذہب کے متعلق کچھ اور کہنا ضروری نہیں پھر بھی اُن کی تصانیف کے سمجھنے کے لیے بہتر ہے کہ اُن کے معتقدات کی بعض ضروری تفصیلات پر عبور ہو اس لیے کہ اس کا اثر ان کی تمام تصانیف میں پایا جاتا ہے۔ ملک محمد جائسی صرف اس وجہ سے مسلمان نہیں تھے کہ وہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے اور آخر وقت تک اسی مذہب پر قایم رہے۔ بلکہ وہ مذہب اسلام کے تمام اصول و فروع کا دل سے اعتقاد رکھتے تھے۔ ہاں مسلک تصوّف کی طرف بھی رُجحان تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ خدا تک پہنچنے کا صرف ایک ہی راستہ نہیں ہے۔ اکھراوٹ میں ایک جگہ اس کے متعلق خود فرماتے ہیں۔

بدھنا کے مارگ ہیں تیتے
سرگ نکھت تن روواں جیتے

बिधना के मारग हैं तेते।
सरग नखत तन रोवाँ जेते ॥

ترجمہ (خدا تک پہنچنے کے اتنے ہی راستے ہیں جتنے آسمان پر تارے یا

بدن پر روئیں۔
لیکن اس کے ساتھ ہی اسلام کو راہ مستقیم سمجھتے تھے جس کا انھوں نے اکھراوٹ میں ایک مقام پر اظہار بھی کیا ہی۔

تنہ مُنھ پنتھ کہوں بھل گائی جیہ دونوں جگ چھاج بڑھائی
سو بڑ پنتھ محمد کیرا ہی نرمل کیلاس بسیرا

तिन्ह मंह पँथ कहौं भल गाई।
जेहि दोनो जग छाज बढ़ाई॥

सो बड़ पंथ मुहम्मद केरा।
है निरमल कैलास बसेरा॥

ترجمہ} ان میں کا سب سے بھلا راستہ بتاتا ہوں جس سے دونوں جہان میں عزّت افزائی ہوتی ہی وہ راستہ محمد کا ہی جو بہشت کا ٹھکانا ہی۔
اسلام کی صداقت کے متعلّق اکھراوٹ میں ایک جگہ اور فرمایا ہی۔

سانچی راہ شریعت، جہ بسواس نہ ہوئے
پانو رکھ تیتھ سیڑھی نبھرم پہنچے سوئے

ترجمہ} شریعت (اسلام) کا راستہ سچّا ہی جس کو یقین نہ ہو وہ اس راہ میں قدم رکھ کر دیکھے کہ وہ منزل مقصود تک کس طرح بے کھٹکے پہنچتا ہی۔
ملک صاحب کے عہد میں مذہبیت جائس میں غالب تھی اور تصوّف بھی اپنے انتہائے کمال کو پہنچا تھا گویا ملک صاحب نے آنکھ کھولی ارادت اور عقید تمندی کے آغوش میں پروان چڑھے تصوف کے سائے میں اور جان دی دونوں کے متحدہ آستانے پر ـــــ یہی وجہ ہی کہ

مذہب اور تصوّف دونوں کی جھلک ملک صاحب کی تصانیف میں نمایاں طور پر پائی جاتی ہے۔

اعتقادات مذہبی

پدمات اور اکھراوٹ دونوں میں مذہبی اعتقادات کا ذکر ملتا ہے اور آخری کلام کی تو بنیاد ہی اعتقاد پر ہے۔

۱۔ روزِ حساب ۔ مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ قیامت کے دن انسانوں کے اعمال نامے پیش ہوں گے جو میزانِ عدل میں تولے جائیں گے اور بارگاہ عدل میں انسان کے تمام اعضا گواہ کی حیثیت سے اعمال کی تصدیق کریں گے جن کی بداعمالیوں کا پلّہ بھاری ہوگا وہ دوزخ میں داخل کیے جائیں گے باقی جنّت کی سیر کریں گے۔ اس اعتقاد کا ذکر پدماوت میں اس طرح موجود ہے۔

گن [1] اوگن بدھنا پوچھب ہوہہ لیکھ اوجوکھ
وے بن اُب آگے ہو کرب جگت کرموکھ
ہاتھ پانو سرون اور آنکھی
اے سب اُہاں بھریں مل ساکھی

ترجمہ} اچھائی اور بُرائی خدا پوچھے گا۔ حساب کتاب ہوگا۔ جنھوں نے دنیا میں اچھا کام کیا ہوگا وہ انکسار کے ساتھ آئیں گے اور انھیں بہشت

गुन औगुन विधिनापुछबहोइहि लखऔ जो रव
वैबिनउब आगेहो, करब जगत कर मोख ॥

हाथ, पांव, सरवन औ आखी ।
ए सब उहां भरहिं मिलि साखी ॥

ملے گی وہاں ہاتھ، پانْو، کان اور آنکھیں سب مل کر گواہی دیں گے۔

۲۔ صراط۔ مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ جنّت کی راہ میں ایک نہایت دشوار گزار مرحلہ ہے۔ نیک بندے اس پر سے گزر جاتے ہیں اور بدکار قاصر رہتے ہیں اس پُل کا ذکر پدماوت میں تو بغیر نام کے اور اکھراوٹ میں نام کے ساتھ ہوا ہے۔

پدماوت۔ کھاڑے چاہیں پین بہتائی بار چاہ تاکر پترائی

ترجمہ} کسی کے واسطے تیز دھار والی تلوار بن جاتا ہے اور کچھ کے لیے پُل۔

खाड़े चाहिं पैनि बहुताई ।
बार चाहि ताकर पतराई ॥

(पदमावत)

اکھراوٹ۔ ناسک پُل صراط پنتھ چلا
تیہ کر بھنوہیں ہیں دوئی پلا

ترجمہ} ناسک گویا (پُل) صراط کا راستہ چلا گیا ہے۔

नासिक पुलसरात पथ चला ।
तेहि कर भौंहैं हैं दुई पला ॥

(अखरावठ)

۳۔ ایک اور اعتقاد۔ قرآن میں آدم کے جنّت سے نکالے جانے کا سبب حکمِ خدا کی خلاف ورزی ظاہر کیا گیا ہے اور اسی سلسلے میں شیطان کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ پدماوت میں بھی پدمنی کی رخصتی کے وقت اس کی سہیلیوں کی زبانی اس خیال کو یوں ظاہر کیا ہے۔

آدِ انت جو پتا ہمارا اوہو نہ یہ دن ہئے بچارا
چھوہ نہ کینہہ نچھوہی اوہو کاہم دوش لاگ اس گوہو

आदि अंत जो पिता हमारा । ओहु नयह दिन हिये बिचारा ॥
छोह न कीन्ह निछोही ओहू । काहम्ह दोष लाग अस गोहू ॥

ترجمہ } ہمارا جو اوّلین باپ ہو اس نے بھی اس دن کی فکر نہ کی تھی اور یہ خیال نہ کیا ہوگا کہ ایک دانہ گندم سے ہم پر یہ الزام آجائے گا۔

اپنے مذہب کے اس قدر پابند ہونے کے بعد بھی ملک محمد متعصب نہ تھے یہی نہیں بلکہ تعصب سے اُنھیں نفرت سی تھی چنانچہ ایک روز جب امیٹھی کا راجا عبادت میں مشغول تھا تو ان کو اس وجہ سے محل تک جانے کی اجازت نہیں ملی کہ یہ مسلمان تھے اس سے ان کو بہت رنج ہوا اور خشمگیں واپس آئے جب راجا کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ نادم ہوا کہ ایسے صلح کل مذہب رکھنے والے کو میری عبادت گاہ میں آنے سے کیوں روکا گیا۔ واقعی اُن کا مسلک محبت تھا اور بس۔ شاعر جائسی کی بے تعصبی کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہو کہ انھوں نے مسلمان ہوتے ہوئے راجپوتوں کی بہادری کو کیسا کیسا سراہا اور اس کو اپنی ایک غیر فانی نظم کا موضوع قرار دیا۔ وہ ہر مذہب کے بزرگوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ رواداری اُن کا مذہب تھا اور اُنس اُن کا شعار۔

ارادت یا شرف بیعت

پدماوت اور اکھراوٹ دونوں میں ملک صاحب نے اپنے مُرشد کے سلسلۂ بیعت کا ذکر بہت شرح و بسط کے ساتھ کیا ہی۔ اپنے آخری کلام میں بھی شاعر جائسی نے اپنی ارادت اور عقیدت کا تذکرہ کیا ہی۔ ان تذکروں

سے حسب ذیل سلسلۂ بیعت مستنبط ہوتا ہے۔ جو شاہ نظام الدین اولیاؒ تک پہنچتا ہے۔

نظام الدین اولیاؒ (وفات سنہ ٦٢٤ھ)

سراج الدین (وفات سنہ ٧٥٨ھ)

شیخ علاء الحق (وفات رجب سنہ ٨٠٠ھ)

شیخ نور قطب عالم بنگالی (پنڈوتی کے)
(وفات سنہ ٨٥١ھ)

شیخ حسام الدین (مانکپور)
(وفات سنہ ٨٨٢ھ)

سید راجے حامد شاہ
(وفات سنہ ٩٠١ھ)

شیخ دانیال
(وفات سنہ ٩٩٤ھ)

سید محمد

شیخ اللہ داد

شیخ برہان (کالپی کے)

شیخ محی الدین (شیخ محمدی)

ملک محمد جائسی

سید اشرف جہانگیر
(وفات سنہ ٨٠٨ھ)

شاہ عبدالرزاق نورالعین
(وفات سنہ ٨٧٣ھ)

شاہ سید احمد خلف رابع

شاہ عبدالرزاق
(وفات سنہ ٩٠٦ھ)

شاہ سید حاجی قتال[1]

شاہ جلال اوّل
(باپ کے سامنے ہی انتقال ہوا)

شاہ مبارک بودلہ (وفات سنہ ٩٧٤ھ)

ملک محمد جائسی

شاہ سید کمال (وفات سنہ ٩٨٤ھ)

---

[1] ان بزرگ نے شاہ مبارک بودے اور شاہ کمال دونوں کو تعلیم دی۔

اگرچہ اس سلسلے سے ملک محمد جائسی کا بہ یک وقت محی الدین اور شاہ مبارک بودلہ دونوں کی بیعت میں ہونا ظاہر ہوتا ہے لیکن ملک صاحب کے انداز تخاطب اور ترتیبِ بیان میں جو فرق نمایاں ہے اس سے اور نیز دیگر قراین سے یقینی طور پر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ملک صاحب کو اولاً شاہ مبارک بودے سے ارادت تھی اور ان کا شمار شاہ صاحب کے خلفا[1] میں تھا۔

ملک صاحب کا ایک ابتدائی تصنیف "آخری کلام" میں اپنی ارادت[2] کا ذکر فرماتے ہوئے سیّد اشرف جہانگیر کو "پیر پیارا[3]" اور "مانک اُجیارا" (آبدار ہیرا) کہنا اور اس سلسلے میں محی الدین کا قطعاً ذکر نہ کرنا بھی اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ ملک صاحب کا سلسلۂ ارادت ابتداءً سید اشرف جہانگیر کے گھرانے سے تھا بعد میں محی الدین سے بھی شرف بیعت حاصل ہوا۔ جیسا کہ بعد کی دو تصنیفات یعنی پدماوت اور اکھراوٹ میں سلسلۂ ارادت ان کے نام کے ساتھ "گرو" اور "کھبوک" کے اضافے سے ظاہر ہے۔

---

[1] خلیفہ دوم از مریدان حضرت سید مبارک بودلہ مستغرق بحر عشق حضرت احد جل جلالہ، وواقف اسرار شریعت جناب احمد صلی اللہ علیہ وسلم جناب ملک محمد جائسی ہستند کہ حضرت ایشاں از وقف اسلاف خود ارادت و عقیدت بایں دودماں علیہ اشرفیہ و خاندان سید احمدیہ داشتند۔

(رسالہ عبدالقادر جائسی)

[2] "تن گھر ہوں مرید ہو پیرو" (آخری کلام)

[3] "مانک اک پایوں اُجیارا سیّد اشرف پیر پیارا"

(آخری کلام)

سیّد اشرف جہانگیر اور اُن کے گھرانے کے ساتھ جس خلوص اور عقیدت[۱] مندی کا اظہار ملک محمد جائسی نے فرمایا ہی اور جن الفاظ میں خاندان اشرفی کے چشم وچراغ شاہ مبارک بودے کو سراہا ہی۔ وہ جائس کے اس مقتدر خاندان کے عظمت اور مرتبت کے آئینہ دار ہیں۔

شاہ مبارک بودلہ

آپ اپنے والد ماجد شاہ جلال اوّل سے ارادت رکھتے تھے، اور ان کے انتقال کے بعد مسند خلافت پر رونق افروز ہوئے۔ خاندان اشرفی کی خصوصیات کی بنا پر افراد خاندان کو جو شہرت اور مقبولیت اپنے اپنے عہد میں حاصل ہوئی وہ تنہا شاہ مبارک بودے کی شہرت کی ضامن تھی اس پر خود شاہ صاحب کی غیر معمولی قابلیت اُن کا زہد و ورع اور اُن کے جدّ امجد حاجی شاہ قتال کی تعلیم و تربیت نے جو اضافہ کیا ہوگا اس کا اندازہ کرنا اہل نظر کے واسطے دشوار نہیں —— ریاضت اور نفس کی پاکیزگی نے تصوّف کے جن بلند مراتب پر پہنچا دیا تھا اس نے عزّت اور اعتبار میں ایسا اضافہ کیا کہ خاندانِ اشرفی کا کوئی فرزند قبولیت عام میں ان تک نہیں پہنچتا۔ دینی وجاہت کے ساتھ ساتھ دُنیوی اقتدار بھی کم نہ تھا —— ایسے ذی مرتبت بزرگ اور دین و دنیا کے ایسے بلند دماغ اور باوقار مالک کے سامنے ظاہر ہی کہ کیسی کیسی ہستیوں نے جبہ سائی نہ کی ہوگی —— خلفا کے زمرے میں حضرت نظام الدین بندگی میاں۔ حضرت ملک محمد جائسی اور میاں سلونے ایسے درویش اور کالے پہاڑ جیسی ہستی شامل تھے۔ شاہ صاحب کی تعلیم نے نہ معلوم ایسے اور کتنے درویشوں کو تصوّف کی ایسی بلندیوں پر پہنچا دیا کہ آج صدیوں

---

[۱] "وے مخدوم جگت کے ہوں ان کے گھر باند" (پدماوت)

بعد بھی ایک عالم اُن سے فیوض روحانی حاصل کرتا ہے اور اُن کی آرام گاہیں مرجع خاص و عام بنی ہوئی ہیں۔

درسگاہ تصوّف

تاریخی اور مذہبی اعتبار سے ایک عمارت جائس میں خاص اہمیت رکھتی ہے جو "درگاہ مخدوم صاحب" کے نام سے مشہور ہے اور بہت سی روایات کی حامل بتائی جاتی ہے یہ سیّد اشرف جہانگیر کی درگاہ ہے جو سیّد صاحب موصوف کے چلّہ کشی کی یادگار ہے اس کا تذکرہ نہ صرف اس لیے کیا گیا کہ مرجع خلایق اور اہل تصوّف کے لیے گنجینۂ اسرار ہے بلکہ اس لیے بھی کہ یہی وہ مقام ہے جہاں ملک صاحب کو تصوّف کے درس دیے گئے اور جہاں سے اجازت تبلیغ اُن کو عطا ہوئی۔

اجازت تصوّف

تصوّف کی طرف ملک صاحب کو فطرۃً رجحان تھا اور ریاضت وعبادت کے دلدادہ تھے لیکن ناقص الاعضا ہونے کی وجہ سے تحصیل علم باطن کما حقہٗ نہ کرسکنے کے سبب مایوس ہو گئے تھے ایک مرتبہ سیّد مبارک بودلے کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے ذوق و مجبوری کا ذکر کیا ان کے مرشد نے کہا کچھ مضایقہ نہیں۔ غرض مشغول ریاضت ہوئے اور شاہ صاحب نے حکم دیا کہ بغیر مہمان کے کھانا نہ کھانا ملک صاحب نے ایسا ہی کرنا شروع کیا۔ حُسن اتفاق سے ایک روز بہت تلاش و جستجو کے بعد ایک جذامی لکڑہارا ملا۔ ملک صاحب نے اسی کو دعوت طعام دے دی اور اسے اپنے قیام گاہ پر لائے جب وہ آیا تو ایک ہی فیرنی کے پیالے میں اپنے ساتھ کھانے کو کہا اس نے بہت کچھ عذر کیا اپنی حالت دکھائی مگر انھوں نے ایک نہ مانی اور بصد اصرار اس کو اپنے ہی پیالے میں شرکت پر راضی کیا بچی ہوئی فیرنی کو جو آثار مرض کی سرایت سے بدرنگ ہو چکی

تھی آنکھ بند کرکے پی گئے جب آنکھ کھولی تو اس جذامی کو غایب پایا اور اپنے کو کشادہ دل۔ گویا اس واقعے نے ان کی دنیا بدل دی یہاں تک کہ ان کے پیر نے انھیں خلیفہ بنا کر امیٹھی بھیجا۔

امیٹھی کو روانگی ملک صاحب کے امیٹھی جانے کا واقعہ اہم ہونے کے ساتھ ساتھ ذرا دلچسپ بھی ہے ایک روز حضرت بندگی نظام الدین اور حضرت ملک محمد جائسی نے صلاح کی کہ آخر یہ درس و تعلیم کب تک جاری رہے گی کبھی اجازۂ تصوف بھی نصیب ہوگا۔ آؤ پیر مرشد سے عرض کریں کہ ہم کو کوئی ولایت سپرد ہو کہ ہم بھی تصوف کی تبلیغ کریں اور خلق خدا کو فایدہ پہنچائیں۔ حضرت مبارک نے کچھ غور و فکر کے بعد کہا کہ "تم دونوں امیٹھی میں جاکر وعظ و پند کا سلسلہ چھیڑو!" ان دونوں کو فکر لاحق ہوئی کہ بھلا دو پیر ایک مقام پر کیسے رہیں گے۔ دو تلواریں ایک نیام میں کیسے سمائیں گی لیکن یہ حضرت پیر مرشد کے ادب کے لحاظ سے عذر نامناسب خیال کرکے خاموش رہے۔ آخر ملک صاحب کے دل میں یہ بات آئی کہ درگاہ مبارک شاہی میں دو دروازے ہیں ایک مشرق میں ایک مغرب میں یہ خیال آتے ہی ملک صاحب نے بندگی میاں سے کہا کہ بھائی مغرب کے دروازے سے تم جاؤ اور مشرق والے سے میں جاتا ہوں بندگی میاں لکھنؤ والی امیٹھی پہنچے (جو اب بندگی میاں کی امیٹھی کے نام سے مشہور رہی) اور ملک صاحب گڈھ امیٹھی میں وارد ہوئے اور وہیں کوٹ سے کچھ دور منگرا کے جنگل میں قیام کیا۔

شاعر جائسی کے امیٹھی جانے کے متعلق ایک اور روایت بھی مشہور ہے یعنی جب رفتہ رفتہ شاعر جائسی کی شہرت حدود درگاہ سے نکل کر دور دور

پھیلنے لگی تو ان کو پہنچا ہؤا فقیر سمجھ کر بہت سے لوگ ان کے مرید ہو گئے اور ان کے اشعار بازاروں اور راہوں میں پڑھے جانے لگے۔ ایک فقیر اُن کے بارہ ماسے کو امیٹھی میں گا گا کر بھیک مانگا کرتا تھا ایک دن امیٹھی کے راجا رام سنگھ نے اس بارہ ماسے خاص کر اس دوہے کو

کنول جو بگسا مانسر بن جل گیو سکھائے [1]

سوکھ بیل پن پلہے جو پیو سینچے آئے

ترجمہ} کنول مانسر میں بغیر پانی کے سوکھ گیا۔ سوکھ جانے پر بھی شگفتہ ہو جائے گا اگر محبوب اس کو سینچے۔

سُن کر پوچھا "شاہ جی یہ کس کا دوہا ہے"۔

جواب میں اس فقیر سے ملک محمد کا نام سُن کر راجا نے اُن کو بڑی عزت سے اپنے یہاں بلایا تب سے یہ امیٹھی میں رہنے لگے اور پدماوت وہیں ختم کی۔ کہتے ہیں کہ راجا کے کوئی اولاد نہ تھی جب ان کی دعا کی برکت سے راجا کے یہاں لڑکا پیدا ہؤا تو اُن کا وقار اور بھی بڑھ گیا۔

علمی استعداد پدماوت میں رمل، جغرافیہ، تاریخ اور ہندوؤں کی معاشرت و رسوم کے متعلق ذکر آیا ہے۔ فارسی، سنسکرت، قرآن اور وید سے بھی بعض بعض مقامات پر واقفیت ظاہر ہوتی ہے لیکن محض اس قسم کے الفاظ کے متن میں آنے سے یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ وہ ان تمام علوم پر کماحقہٗ حاوی تھے سولھویں صدی

---

[1] कंवल जो विगसा मानसर बिनु जलगयउ सुखाए ।
सूखि बेलि पुनि अलुहै, जो पिउ सींचै आए ।।

(पद्मावत)

کے لکھے پڑھے مسلمان ہوکر ملک محمد جائسی کا فارسی اور قرآن سے واقف ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ وہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اور آخر دم تک اسی مذہب کے پابند رہے یہی وجہ ہے کہ ملک صاحب نے اپنی تصانیف میں کہیں فارسی قصّوں، شعروں اور ضرب الامثال کا اور کہیں قرآن کی آیتوں کا پورا پورا ترجمہ کر دیا ہے۔ روز جزا (قیامت) صراط اور پیغمبران ماسلف کا ذکر بھی ملک محمد نے اپنی کتاب میں کیا ہے اس کے علاوہ تصوّف کے اصول پر حاوی ہونے اور اس میں مہارت حاصل کرنے کے لیے فارسی زبان کی کافی استعداد ناگزیر بھی ہے۔

کلام اور تصانیف سے ظاہر ہے کہ ملک صاحب اس زمانے کے اکثر مسلمانوں کی طرح فارسی داں ہی نہ تھے بلکہ ہندوؤں کی روایات اور ویدوں کے متعلق درسی اور خارجی معلومات بھی اُنھیں تھیں۔ پدماوت دیکھ کر قیاس ہوتا ہے کہ ہندوؤں کے مختلف فرقوں اور گروہوں سے اُن کا میل جول بھی تھا۔ اور اُن کی صحبت سے انھوں نے بہت کچھ حاصل کیا تھا۔

۱۔ فارسی

(۱) ایک جگہ پدماوت میں ہے کہ

پُرش نہ کرے ناری مت کانچی

ترجمہ} مرد عورتوں کے مکر و فریب پر قابو نہیں پا سکتا۔

فارسی کی تصنیف (سکندر نامے) میں بھی بعینہ اسی خیال کو ادا کیا ہے۔ یعنی آدمی عورتوں کے تریا چرتر" پر قابو نہیں پا سکتا مثال اس کی یہ ہے کہ جب نوشابہ نے دیکھا کہ سکندر کا مقابلہ بے سُود ہے تو اپنی طاقت کا خیال دماغ سے نکال کر اس کی لونڈی بن گئی۔

(۲) علاؤالدین کی چڑھائی کا ذکر کرتے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپوں سے گرد کا آسمان پر چھا جانا ملک صاحب یوں بیان فرماتے ہیں۔

(پدماوت) ست[۱] کھنڈ دھرتی بھئے شت کھنڈا

اوپرا ست بھئے بر مھنڈا

یہ شاہنامہ فردوسی کے اس شعر کا جوں کا توں ترجمہ کیا ہے۔

زسم ستوراں دراں پہن دشت   زمیں شش[۲] شد و آسماں گشت ہشت

ترجمہ } اُس لمبے چوڑے میدان میں گھوڑوں کی ٹاپوں سے طبقاتِ زمین بجائے سات کے چھ رہ گئے۔ اور آسمان سات کے بجائے آٹھ ہوگئے

(۳) دوسرے رتن سین کا پیغام توتا جا کر یوں پہنچاتا ہے۔

(پدماوت) دہوں[۳] جیو رہے کہ نیسرے،   کاہ رجایس ہوئے

یہ فارسی کے اس شعر کے بالکل متوارد ہے۔

عزم دیدار تو دارد جان بر لب آمدہ

باز گردد یا بر آید چیست فرمان شما

ترجمہ } جان تمھارے دیکھنے کے ارادے سے ہونٹوں پر آگئی ہے اب کیا حکم ہے نکل جائے یا رہے۔

ف[۱] सत-खंड धरती भइ षट खंडा ।
ऊपर अस्त भए बरह्मएडा ॥

ف[۲] مسلمانوں کے روایات کے مطابق زمین و آسمان کے طبقات سات ہیں۔

ف[۳] दहुं जिउ रहै कि नी सरै   काह रजायसु होई ॥

۲۔ فارسی ضرب الامثال

(۱) ایک مقام پر ملک صاحب فرماتے ہیں۔

(پدماوت) نیرہیں دؤر، پھول جس کانٹا[1]
دؤر ہیں نیر سو جس گڑ چانٹا

ترجمہ} نزدیک رہتے ہوئے بھی دؤری ہوسکتی ہی جیسے پھول اور کانٹا کہ آپس میں کوئی مناسبت نہیں رکھتے اور دؤر ہونے پر بھی قربت ہوجاتی ہی جیسے گڑ اور چیونٹا کہ الگ الگ ہیں مگر مل جاتے ہیں۔

(فارسی) دؤراں باخبر نزدیک   نزدیکاں بے بصر دؤر

(۲) دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

(پدماوت) پرمیل پریم نہ آچھے چھپا۔[2]

ترجمہ} خوشبو اور محبت چھپائے سے نہیں چھپتی۔

(فارسی) عشق و مشک را نتواں نہفت۔

ترجمہ} عشق و مشک کو چھپا نہیں سکتے۔

۳۔ عربی

کئی مقاموں پر ملک محمد نے قرآنی آیتوں کا ترجمہ نہایت صفائی کے ساتھ کیا ہی جس سے معلوم ہوتا ہی کہ وہ صرف عبارت قرآنی کی تلاوت ہی پر دوسرے مسلمانوں کی طرح قادر نہ تھے بلکہ اس کے مطالب و مسایل پر بھی کافی عبور رکھتے تھے اس سے یہ نتیجہ صریح نکلتا ہی کہ ان کو عربی سے کافی واقفیت تھی۔

۱؎ निपरहिं दूर, फूल जस कांटा।
दूरहिं नियर सो जस गुर चांटा॥

۲؎ परिमल प्रेम न आछै छपा।

پدماوت میں جو نعت کہی ہی اس کے شروع ہی میں فرماتے ہیں۔

پرتھم[1] جوت بدھ تاکر ساجی　　او تیہی پریت سہت اُپراجی

ترجمہ} پہلے اللہ تعالیٰ نے نورِ اُسی کا سنوارا اور پھر اس کی محبت سے سارا عالم پیدا کیا۔

یہ مضمون رسول کی اس حدیث سے لیا گیا ہی جس میں اُنھوں نے اپنے متعلق کہا ہی۔ کہ

"اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِی وَاَنَا مِنْ نُوْرِ اللّٰہِ وَکُلُّ شَیْءٍ مِنْ نُوْرِیْ"

یہ تو ہُوا حدیث کا ترجمہ ــــ قرآن کی آیتوں کا ترجمہ بھی ملاحظہ ہو اُسی پدماوت میں بعد حمد کے فرماتے ہیں۔

نا اُوہ[2] پُت نہ پِتا نا ماتا
نا اُوہ کُٹنب نہ کوئی سنگ ناتا

ترجمہ} نہ وہ کسی کا بیٹا ہی نہ کسی کا باپ نہ کسی کی ماں۔ نہ وہ کسی کا کفو ہی نہ رشتے دار ــــ اسے پڑھیے اور پھر قرآن کی سورۂ اخلاص، تو معلوم ہو جائے گا کہ اس کا ماخذ "لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ" ہی۔

ترجمہ} نہ اس کے کوئی اولاد ہی اور نہ وہ کسی کی اولاد ہی نہ اس کا کوئی ہمسر یا رشتے دار ہی۔

---

[1] प्रथम जोति बिधि ताकर साजी ।।
औ तेहि प्रीति साइस उपराजी ।

[2] ना ओहि पुत न पिता ना माता ।।
न ओहि कुटुंब न कोइ संग नाता ।

ایک جگہ اور حمد ہی میں فرماتے ہیں:۔

(پدماوت) کینھس[1] مانش دِہس بڑائی
کینھس انّ بھگت تہہِ پائی

ترجمہ} آدمی کو پیدا کیا اور اُسے شرف دیا غلّہ پیدا کیا اور اس سے رزق عطا کیا۔ یہ وہی آیت " وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ آدَمَ" ہے جس کی طرف اشارہ ہے۔

ترجمہ} اور ہم نے اولاد آدم کو عزّت دی۔

پدماوت کی اس سطر میں کہ

چھارہِیں[2] تے سب کینھس پُن کینھس سب چھار

ترجمہ} مٹی سے سب کچھ پیدا کیا اور بعد کو سب مٹی ہی میں ملا دیا۔

قرآن کی کئی آیتوں کا مضمون پایا جاتا ہے۔ سورہ حج کی ایک آیت میں ہے فَاِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِنْ تُرَابٍ

ترجمہ} تو ہم نے تم کو مٹی سے بنایا۔

اور سورہ مومنون میں آیا ہے

"وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَۃٍ مِّنْ طِیْنٍ"

ترجمہ} اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے بنایا۔

۱؎ कीन्हेसि मानुष दिहेसि बड़ाई।
कीन्हेसि अन्न, भुगुति तेहि पाई॥

۲؎ छारहिं ते सब कीन्हेसि।
पुनि कीन्हेसि सब छार॥

اور سورہ طٰہٰ میں تو لفظ بہ لفظ یہی موجود ہے۔

"مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى"

ترجمہ} ہم نے انسان کو مٹی سے بنایا اس کو اسی مٹی میں ملا دیں گے آخر اسی مٹی سے نکالیں گے۔ یہ اور اسی قسم کی اور آیتیں بھی ہیں جو ان کے کلام میں ترجمے کی صورت میں ملتی ہیں لیکن یہ ترجمے صرف حمد و نعت اور منقبت کے ذیل میں ملیں گے۔

سنسکرت گری یرسن[1] صاحب نے "سدھاکر چندریکا" کے دیباچے میں لکھا ہے کہ جائس میں آکر ملک محمد نے سنسکرت عروض اور زبان کی واقفیت پنڈتوں سے حاصل کی لیکن اس کا کوئی ثبوت گری یرسن صاحب نے پیش نہیں کیا۔

ملک محمد صاحب کی نظم سے تو ان کی سنسکرت جاننے کا کچھ پتہ نہیں چلتا کیونکہ الفاظ جو ان کی سنسکرت دانی کا ثبوت دیں۔ اول تو کم ہیں اور

---

[1] سر جارج گری یرسن (آئی۔ سی۔ ایس) Sir George Grierson I.C.S. ایک بڑے مستشرق ہیں اور آپ کا شمار ہندی ادب کے ممتاز ارکان میں کیا جاتا ہے۔ بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی Asiatic Society of Bengal نے ان کے اور سدھاکر جی "مہامہوپادھیا" کے سپرد یہ خدمت کی تھی کہ یہ دونوں پدماوت کا ترجمہ انگریزی اور ہندی نثر میں کریں مگر افسوس کہ سدھاکر جی کی موت نے اس کام کو مکمل نہ ہونے دیا۔ گری یرسن صاحب نے اس کتاب کا دیباچہ انگریزی میں لکھا ہے جس میں ملک صاحب کی کچھ سوانح زندگی بھی دیے ہیں۔ سدھاکر جی نے ہندی میں ترجمہ کیا ہے کتاب کا نام اسی وجہ سے "سدھاکر چندریکا" ہے۔

جو ہیں وہ بھی ایسے جن سے ہر ہندی پڑھا لکھا شخص واقف ہوتا ہے اگر ملک محمد سنسکرت سے کافی واقف ہوتے تو ایک ہی لفظ کو بار بار استعمال کرنے کے بجائے اس کے مترادف سنسکرت کے الفاظ لاکر مزید فصاحت کا ثبوت دیتے اور ایک ہی لفظ کی تکرار نہ کرتے۔ مثال کے طور پر چند ایسے الفاظ لیجیے جنھیں جائسی نے اتنی مرتبہ استعمال کیا ہے کہ طبیعت گھبرا جاتی ہے اور جن کے مترادف الفاظ سنسکرت میں بہت ہیں۔[1] توتے (سوا) کے لیے ملک صاحب نے "روی"۔ "بھانو"۔ "دنکر" سورج اور چاند کے لیے "سسی"۔ "سس ہر" اور "مینک" ہی لکھا ہے حالانکہ ان کے مترادفات کثرت سے سنسکرت میں موجود ہیں جو فصیح بھی ہیں اور رائج بھی۔ یہ درست ہے کہ بعض الفاظ خود ایسے ہوتے ہیں اور بعض دوسرے الفاظ سے مل کر ایسے ہو جاتے ہیں کہ ان کے بجائے دوسرا لفظ لانے سے بھونڈا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ خواہ وہ الفاظ کسی دوسرے موقع پر کتنے ہی فصیح کیوں نہ ہوں ایک بہت عام مثال اس کی میر صاحب (میر انیس) کے مرثیے کا مصرع

"کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا"۔ جس میں "اوس" کے لفظ نے وہ لُطف دیا ہے جو فصیح تر مترادف الفاظ سے پیدا نہیں ہو سکتا تھا لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ "اوس" کی بھرمار کر دی جائے اور مرثیہ 'اوس' سے تر بتر دکھائی دینے لگے۔ رہ گیا اس نظم کا اسلوب سو اول تو شاعر کا اسلوب بیان وہبی ہوتا ہے اور اگر اکتسابی مان لیا جائے تو بھی یہ پنڈتوں کے بجائے شاعروں سے اخذ کیا گیا ہوگا چونکہ پدماوت سے پہلے بھی اس قسم کی نظمیں لکھی جا چکی تھیں اسی طرح ممکن ہے کہ "کوئی ریت" بھی انھوں نے

---

[1] ماخوذ از جائسی گرنتھاولی مصنفۂ پنڈت رام چند شکل۔

کسی شاعر سے سیکھی ہو۔

پدماوت میں دینر (سورج) दिनिअर سس ہر (چاند) ससहर
آہٹ (آٹھ) आहट بھوال (راجا) भुवाल بس ہر (فنا کرنے والا) बिसहर
پھومی (زمین) पुहमी سیر نگھی (دروپدی کا دوسرا نام)، گنگیو (بھیشم کا نام) پراتھ (ارجن کا نام) جیسے الفاظ کے استعمال سے بھی گری یرسن کے قول کی قطعی تائید نہیں کی جا سکتی۔ ممکن ہے کہ ان الفاظ کا استعمال محض معلومات خارجی کا رہین منت ہو جیسا آج کل صدہا عربی اور سنسکرت سے بے بہرہ لوگ ہزار ہا عربی اور سنسکرت کے الفاظ محض سُن کر یا دوسری زبانوں کی کتابوں میں مستعمل دیکھ کر جان گئے ہیں اور استعمال کرتے ہیں۔

ایک اور بات بھی ملک محمد جائسی کی سنسکرت دانی کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے یعنی یہ کہ اکثر سنسکرت کے اشلوکوں کے مضامین ان کے اشعار میں موجود ہیں جن کے متعلق توارد کا حکم مشکل سے لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً پدماوت میں یہ دوہا

بھنور جو پاوا کنول کہنہ من چیتا بہو کیل
آئے پرا کوئی ہست تنہ چور کیو سو بیل

भँवर जो पावा कँवल कहं, मन चीता बहु केलि ।
आइ परा कोइ हस्ति तँह, चूर किएउ सो बेलि ॥

(पदमावत)

سنسکرت کے اشلوکوں سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے، بھنورا جو کہیں کنول کو پاتا ہے خوب جی بھر کر اس میں رہتا ہے۔ کسی ہاتھی

نے اس کنول کو توڑ دیا وہ بھی اس کے ساتھ مر گیا۔

چانکؔ[1] کے ایک اشلوک کا ترجمہ بھی پدماوت میں موجود ہی ملاحظہ ہو۔

[2] تھل تھل نگ نہ ہوہیں، جیہہ جوتی   جل جل سیپ نہ اُپنھیں موتی

بن بن برکش نہ چندن ہوئی   تن تن ورہ نہ اپنے سوئی

(پدماوت)

ترجمہ} ہر زمین میں چمکدار جواہر نہیں ہوتے اور ہر پانی کی سیپ موتی پیدا نہیں کرتی ہر جنگل میں چندن کے پیڑ نہیں ہوتے اسی طرح ہر آدمی کو جدائی نہیں ستاتی۔ لیکن اس قسم کے خیالات بھی انھیں بھاشا کے شاعروں کے وساطت سے مل سکتے تھے پس یہ بھی ان کی سنسکرت دانی کی دلیل قطعی نہیں ہو سکتی۔ کم سے کم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سنسکرت اور "کوئی ریت" انھوں نے جائس ہی میں سیکھی کہیں سیکھی ہو سیکھی ضرور اور پنڈتوں ہی سے سیکھی۔

۵۔ بھاشا اور سنسکرت

جہاں سنسکرت دانی میں یقین کے قراین نہیں وہاں اس میں شک کی گنجایش بھی

---

[1] چانک کے سنسکرت اشلوک کا ترجمہ یہ ہی۔

ہر پہاڑ میں جواہرات نہیں ہوتے۔ ہر پانی میں موتی نہیں ہوتا۔ ہر جنگل میں چندن نہیں ہوتا اسی طرح سب جگہ سادھو نہیں ہوتے۔

[2]
थल थल नग न होहिं जिह जोती।
जल जल सीप न उपनहिं मोती॥

बन बन बृक्ष न चंदन होई।
तन तन बिरह न उपन सोई॥ (पदमावत)

نہیں کہ ان کو بھاشا اور پراکرت میں استعداد کامل تھی ایسی استعداد کہ پدماوت جیسی داستان نظم کر ڈالی پدماوت جس میں بقول حضرت آزاد دوسری زبان کا لفظ صفحے کے صفحے اُلٹ جایئے نہ ملے گا اور جو تھوڑے سے الفاظ غیر زبانوں کے کہیں کہیں ہیں اُن سے ادب اُردو اور ہندی کے ارتقا اور علیحدگی کا پتہ چلتا ہے۔

۶۔ عروض معلوم ہوتا ہے کہ عروض سے ملک صاحب بخوبی واقف نہ تھے کیونکہ اوّل تو اپنی نظم چوپائی۔ دوہے میں لکھی ہے جو ہندی اقسام نظم میں سب سے سہل سمجھی جاتی ہے اور پھر اس میں بھی عروض کی غلطیاں پائی جاتی ہیں عروض کی یہ ناواقفیت بھاشا کے اکثر متقدمین میں دیکھی جاتی ہے گسائیں تلسی داس جی کی شاعری بھی عروض کے عیوب سے خالی نہیں۔

۷۔ ویدانت اور پران ویدانت کے کئی باتوں کی جھلک پدماوت میں پائی جاتی ہے جسے ہندو سادھوں اور مہاتماؤں کا فیض صحبت سمجھنا چاہیے۔ پدماوت کے مطالعے کے بعد پنڈت رام چندر شکل کی رائے ہے کہ پرانوں کے متعلق ملک محمد کو معلومات تھی مگر ناکافی وہ یہ جانتے تھے کہ "کُبیر" کا مقام "الکاپوری" ہے کیونکہ وہ بادشاہ کی بھیجی ہوئی "یوگنی" سے کہلواتے ہیں "گیوں[۱] الک پور جہاں کُبیر و"۔ لیکن اندر کے مستقر کو جو کہ "سورگ" (جنت) ہے اس کو وہ "کیلاش" ہی کہتے ہیں۔ شکل جی ایک جگہ تو یہ

---

[۱] गइउँ अलकपुर जहाँ कुबेरू।

(पद्मावत)

فرماتے ہیں اور دوسری جگہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ملک صاحب "سورگ" کو ہمیشہ آسمانوں کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ جب یہ تسلیم ہی کہ "سورگ" کے معنی ملک صاحب نے اپنی تحقیق یا سہو کی رُو سے آسمان کے قرار دے لیے تھے تو سورگ کو اندر کا مستقر لکھنا پران سے ناواقفیت کا ثبوت ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اندر کا مقام آسمان نہیں بلکہ بہشت ہی۔ اب صاف ظاہر ہی کہ کیلاش سے ان کی مراد ہمیشہ بہشت تھی اور وہ اس سے ناواقف نہ تھے کہ اندر کا مقام بہشت ہی۔

شکل جی فرماتے ہیں۔

"پرانوں[1] میں سات جزیروں اور سات سمندروں کا ذکر آیا ہی ملک محمد نے جزیروں کے نام تو نہیں لیے ہیں ہاں سات سمندروں کے گنوانے کی ضرورت انھیں سمندر کے بیان میں ہوتی ہی۔ ان میں دو نام "ملکا" اور "مانسر" پرانوں کے مطابق نہیں ہیں۔ پرانوں میں ایک ہی مانسر یور شمال میں مانا گیا ہی لیکن ملک محمد نے اسے سنہل کے پاس بتایا ہی حالانکہ یہ جھیل ہی مگر اس کو بھی سات سمندروں میں گن لیا ہی۔ اس کے علاوہ ہندو قصوں کا اگر پورا پورا علم ہوتا تو وہ چاند کو مؤنث نہ لکھتے۔"

جہاں تک واقعات کا تعلق ہی شکل صاحب کا بیان حرف بحرف درست ہی مگر محض سات ناموں سے دو کا غلط ہو جانا یا سمندر کو جھیل کہ جانا حافظے کی غلطی سے بھی ہو سکتا ہی اور ضرورت شعری سے بھی

---

[1] عروض۔ ویدانت اور پران وغیرہ کے متعلق بیشتر معلومات رام چندر شکل کی جائسی گرنتھاولی سے ماخوذ ہیں۔

بعض اوقات حافظے کے اعتبار پر غلطیاں ہر شخص سے سرزد ہو جاتی ہیں۔ رہا ملک صاحب کا چاند کو مؤنث لکھنا سو اس کی توجیہہ خود شکل جی نے کر دی ہے یعنی یہ کہ شاعر جائسی نے ایسا ان اقوال کے زور پر کہا ہے جس کی بنا پر اودھ میں "چندا میا" (MOTHER MOON) کہتے ہیں۔ لیکن یہ توجیہہ ملک صاحب کی فروگزاشت سے بھی عجیب تر ہے۔ اس لیے کہ اودھ تو بڑا خطہ زمین ہے خود جائس میں جہاں ملک صاحب نے نظم لکھی ہے چاند کو "چندا ماموں" (UNCLE MOON) کہہ کر بچوں کو بہلاتے ہیں البتہ ممکن ہے کہ ملک صاحب کے یہاں چاند کی تانیث عربی زبان سے ماخوذ ہو کیونکہ عرب میں چاند بہ اعتبار اپنے حسن اور نرمی و خوشگواریِ نور کے مؤنث بولا جاتا ہے۔

۸۔ رامائن اور مہابھارت مہابھارت اور رامائن کے مشہور واقعات اور روایات کے متعلق یہ کہنا کہ شاعر جائسی کو ان کا علم خوب تھا اور ان کی یہ معلومات بہت زیادہ تھی غیر ضروری ہے کہ یہ کارنامے تو وہ ہیں جو ایک طرف اہل وطن کا سرمایۂ افتخار اور دوسری طرف اہل مذہب کے لیے خضر راہ ہیں۔

۹۔ جغرافیہ علم تاریخ اور جغرافیے کے معاملے میں ہندستان کے پرانے زمانے کے لوگ طفل مکتب تھے ایسے وقت میں اپنے شہر کے مختلف مقامات کے متعلق بھی اگر تھوڑی بہت معلومات ہو تو اسے بہت سمجھتے چہ جائیکہ مُلک کے مختلف حصّوں اور باہر کے ملکوں کی واقفیت جن سے اہل ہند کے قطع تعلّق کو مدّتیں گزر چکی تھیں سنہل دیپ اور لنکا کے بس نام ہی نام یاد رہ گئے تھے اسی حالت میں اگر کسی کو سنہل کے

محل وقوع کا ٹھیک علم نہ ہو تو کوئی مقام تعجب نہیں۔ جائسی سنہل دیپ کو پورب سمجھتے تھے اور لنکا کو وہ سنہل کے دکھن میں مانتے تھے۔

یہ بات نظم کے اُس[1] حصے کو غور سے پڑھنے سے ظاہر ہو جاتی ہے جس میں سنہل سے پلٹتے وقت طوفان میں بہ کر رتن سین کے جہاز کے غارت ہونے کا ذکر کیا ہے۔ ملک محمد اس مقام پر لکھتے ہیں کہ جہاز آدھے سمندر میں بھی نہ آئے تھے کہ اُتر کی ہوا بڑے زور سے اُٹھی اس طوفان کی وجہ سے جہاز راہ بھول کر لنکا کی طرف چل پڑے —— اُتر کی طرف آندھی آنے پر جہاز دکھن ہی کی طرف جائیں گے۔ اس طور سے لنکا دکھن ہُوا لیکن صرف اس غلطی کی بنا پر ملک صاحب کو جغرافیہ اور تاریخ سے بے بہرہ نہیں کہا جا سکتا ان کی واقفیت کا ثبوت اور باتوں سے بخوبی ملتا ہے:-

خلیج بنگال سے بحر الکاہل ہوتے ہوئے جو جہاز چین تک جاتے تھے تملوک (واقع ضلع میدنا پور صوبہ بنگال) اور کالنگ کی بندرگاہیں انھیں راستے سے ملتی تھیں۔ چنانچہ فاہیان[2] نام کا ایک چینی سیاح تملوک ہی سے جہاز میں بیٹھ کر چین واپس گیا تھا۔ یہی راستہ ملک صاحب نے

---

[1] आधे समुद ते आए नाहीं।
उठी बाउ आंधी उतराहीं॥

बोहित चले जो चितउर ताके।
भए कुपंथ लंक दिसि हाके॥

(पद्मावत)

[2] فاہیان راجہ چندر گپت کے زمانے میں ہندستان آیا تھا۔

پدماوت میں لکھا ہی۔ اُڑیسہ کے دکھن کالنگ میں "کلنگ پٹن" نام ایک پُرانا شہراب بھی سمندر کے کنارے بسا ہوا ہی۔ جزیرۂ بالی اور "لنک" کے ہندو اپنے کو کالنگ ہی سے آئے ہوئے بتاتے ہیں۔

ملک صاحب ایک جگہ اور فرماتے ہیں:۔

آگے پاؤ[1] اُڑیسہ بائیں دئے سو باٹ
دہنا ورت دیئے کے اتر سمندر کے گھاٹ[2] (پدماوت)

یہ معلومات یہیں تک نہیں ختم ہو جاتی بلکہ پوربی سمندر کی بہت سی خصوصیات بھی ملک صاحب کو معلوم تھیں مثلاً بحرالکاہل کے جنوبی حصّے میں مونگے سے بنے ہوئے بہت سے ٹاپوؤں میں کہیں کہیں مونگوں کی تہ پر تہ جمتے جمتے ٹیلے بن جاتے ہیں۔ کافور نکالنے والے پیڑ بھی اس سمندر کے جزیروں میں بکثرت ہیں ایسی خصوصیات کا پرانے زمانے کے مسافروں کو خاص طور پر خیال رہتا ہو گا چنانچہ پدماوت میں بھی اس کا ذکر ہی۔

راجا[3] جائے تہاں بہہ لاگا جہاں نہ کینھ سندیسا کاگا
تہاں ایک پربت اہ ڈونگا جہہ واں سب کپور اُو مونگا

---

[1] आगे पाव उडैसा, बाएं दिए सो बाट।
दहिना वरत दइकै, उतरु समुद्र के घाट॥

[2] "سمندر کے گھاٹ" سے مراد کلنگ کا بندرگاہ ہی۔

[3] राजा जाइ तहां वहि लागा।
जहां न कीन्ह संदेसा कागा॥
तहां एक परवत ग्रह हूँगा।
जहँवां सब कपूर ओ मूंगा॥
(पदमावत)

ملک محمد نے چتوڑ سے سنہل جانے کا جو راستہ بیان کیا ہی گو وہ زیادہ مفصّل نہیں ہی لیکن اس سے دکھن خاص کر ممالک متوسّط کے مقاموں کا علم ظاہر ہوتا ہی۔ چتوڑ سے رتن سین مشرق کی طرف چلتا ہی کچھ چلنے پر جائسی کہتے ہیں۔

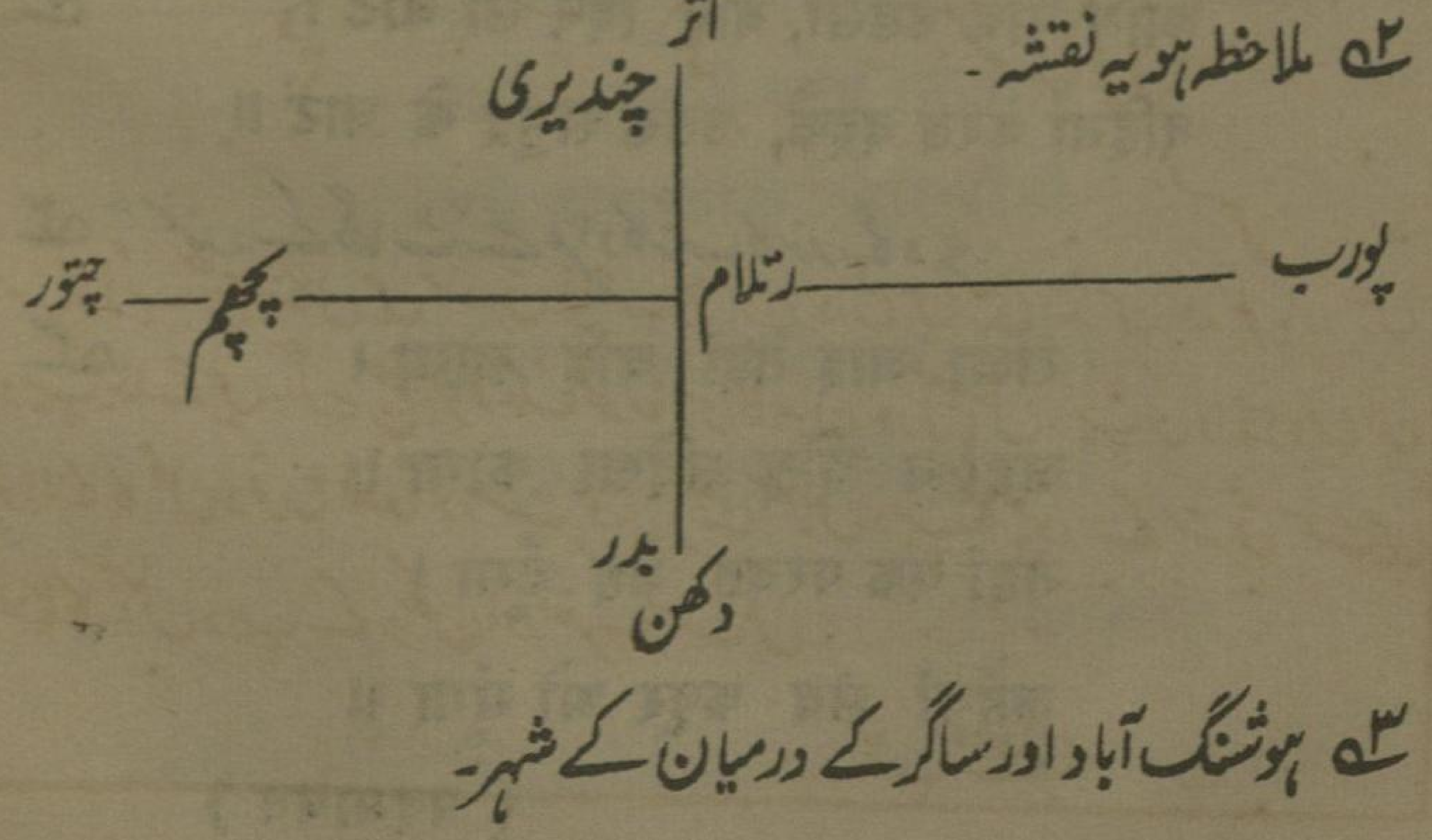
دہنے[1] بدر بائیں چندیری

رتن سین چتوڑ سے مشرق کی طرف چلا اور رتلام کے پاس آنکلا جہاں سے چندیری بائیں یا شمال[2] کی طرف اور بدر جنوب کی جانب پڑے گا۔ رتلام سے د.ج گڑھ (جو صوبۂ مالوہ کا دارالسلطنت تھا) ہوتے ہوئے اندھیار[3] کھٹولا کو بائیں یا اُتر طرف چھوڑتے ہوئے گونڈوں کے ملک گونڈوانے میں پہنچ کر کہتا ہی۔

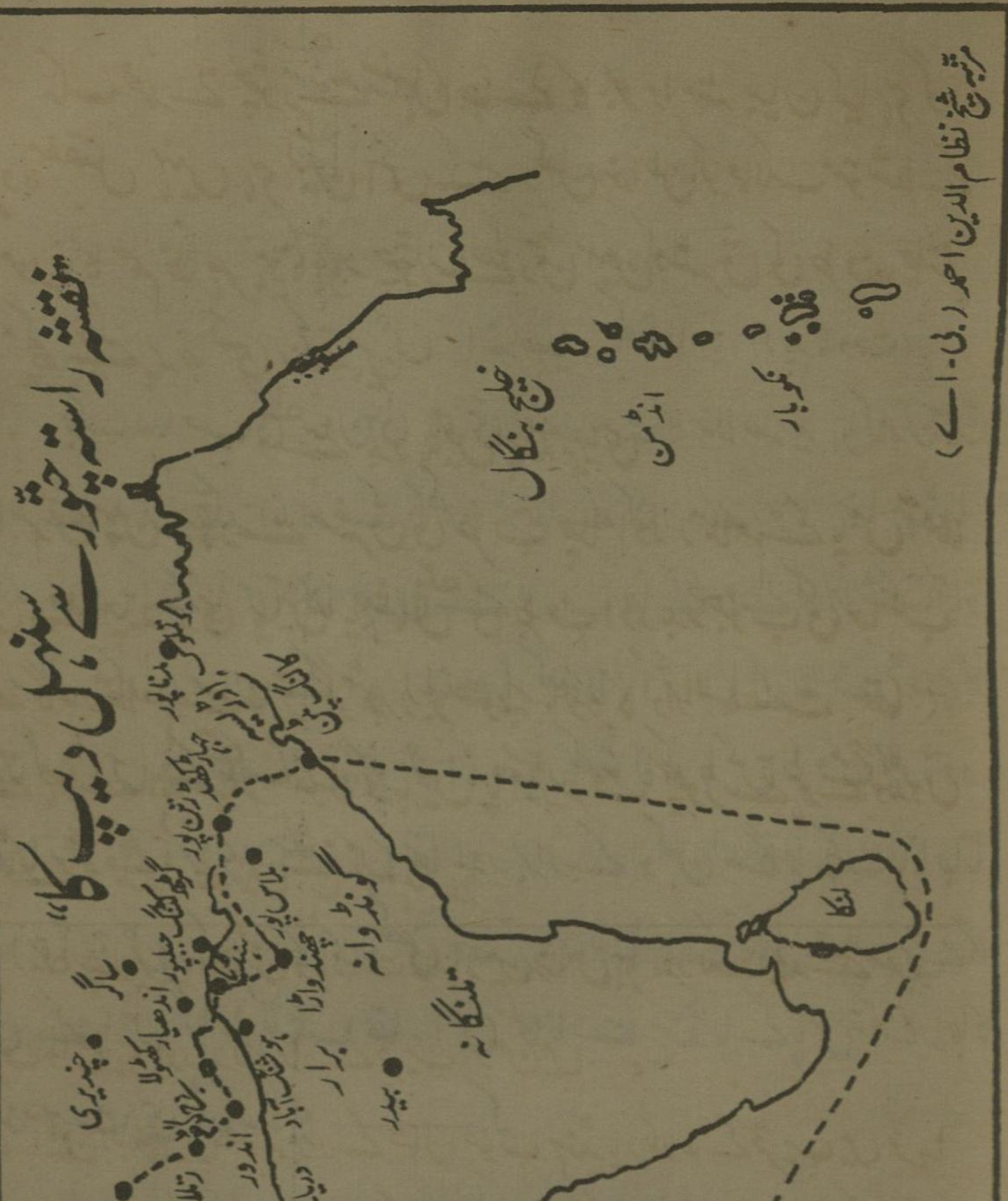
لہ چندیری آج کل ریاست گوالیار میں شامل ہی اور للت پور سے مغرب کی طرف واقع ہی اور بدر (برار کے قریب) دکھن میں۔

آئین اکبری میں صوبہ برار کے شمال جنوب ہنڈیا (گدھ کے قریب یں نربدا کے کنارے ایک چھوٹا قصبہ) سے بدر تک ۱۸۰ کوس لکھا ہی اور برار کے دکھن تلنگانا بتایا گیا ہی۔

سے ملاحظہ ہو یہ نقشہ۔



سے ہوشنگ آباد اور ساگر کے درمیان کے شہر۔



نوٹ:۔ کچھ لوگ خلیج بنگال میں مشرق جانب جو جزایر واقع ہیں یعنی انڈمن اور نکوبار اُنھیں سنہل دیپ بتاتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہو تو ملک محمد جائسی کا بیان اور سنہل دیپ کی واپسی پر اُن کا بتایا ہوا لنکا کا محل وقوع قطعاً درست ہوتا ہے یعنی سنہل دیپ کا چتوڑ کے مشرق سمت میں ہونا اور لنکا کا سنہل دیپ کے دکھن اور مغرب سمت میں۔

کلب مصطفیٰ

سنو[1] مت کاج چہس جو ساجا
بیجا[2] نگر بجے گڑھ راجا
پہنچیو جہاں گونڈ او کولا
تج بائیں اندھیار کھٹولا (پدماوت)

ملک صاحب کی بیان کی ہوئی تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ رتن سین رتلام کے پاس چکد اندور کے دکھن نربدا کے کنارے ہوتا ہوا ہنڈیا یا (ہردوار) کے پاس نکلا جہاں سے پورب جانے والے کو ہوشنگ آباد اور ساگر کے درمیان کے شہر (اندھیار کھٹولا) اُتریا بائیں طرف پڑے گا۔ جب گونڈوں کے ملک میں پہنچو تو اندھیار کھٹولا کو بائیں طرف چھوڑ دو۔ ہنڈیا برار کے اُتری حصے میں تھا اور برار کے دکھن تلنگانا ملک مانا جاتا تھا (جو آج کل کے برار کا بھی دکھنی حصہ ہے) ہنڈیا کے شمال جبلپور پڑے گا جس کے پاس گڑھ کٹنگ تھا۔ اس لحاظ سے ہنڈیا کے پاس شنک راجا کا یہ کہنا بہت ہی ٹھیک ہے ——— کہ

---

[1] सुनु मत, काज चहिस जो साजा।
बीजा नगर बिजयगढ़ राजा॥

पहुंचहु जहां गोंड ओ कोला।
तजि बाएँ अँधियार खटोला॥

(पद्मावत)

[2] بیجا نگر اندور کے دکن نربدا کے دونوں طرف پھیلی ہوئی سلطنت ہے۔

دکھن[1] دہنے رہیں تلنگا اُتر بائیں گڑھ کا ٹنگا
مانجھ رتن پور سنگھ[2] دوارا جھار کھنڈ دیتے بانون پہاڑا

رتن پور سے پھر شنک راجا سرگی کا جنگل (جھار کھنڈ) اُتر چھوڑتے ہوئے آگے بڑھنے کو کہتا ہی اور یہ بھی کہتا ہی کہ اگر برابر آگے بڑھتے جاؤگے تو اُڑیسہ میں پہنچ جاؤگے اس لیے اس راجا پر کچھ دُور چلنے کے بعد اُڑیسہ جانے والے راستے کو چھوڑ کر دکھن کی طرف گھوم پڑنا۔ دکھن پہنچنے پر ملک کالنگ ہی اور اس سے گزر کر سمندر کا گھاٹ (یعنی کلنگ کا بندرگاہ) ملے گا۔

آگے پاؤ اُڑیسہ بائیں دیہ سو باٹ دہنا ورت دے کر اُتر سمندر گھاٹ

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہی کہ جائسی نے چتّور سے کلنگ تک جانے کا جو راستہ لکھا ہی وہ یونہی اٹکل پچّو نہیں ہی بلکہ یہ مقامات اب بھی تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اُسی طرح واقع ہیں جیسے کہ بیان کیے گئے۔

اس کے علاوہ شاعر جائسی کو دُور دُور کے مقاموں کے نام

---

[1] दक्खिन दहिने रहहिं तिलङ्गा।
उत्तर बाएँ गढ़ काटंगा॥

माँझ रतन पुर सिंह दुवारा।
झार खंड देइ बांव पहारा॥

[2] یہاں پر ضرورت شعری کی وجہ سے سنہہ دوارا (جھنڈوارہ) کے پہلے رتن پور کہا ہی حالانکہ ہنڈیا سے پورب جانے والے کو پہلے جھنڈوارہ پڑے گا تب رتن پور جو ضلع بلاسپور میں واقع ہی۔

بھی معلوم تھے۔ بادشاہ کی طرف سے جب ایک عورت جاسوس بن کر چتوڑ گئی ہے اس نے جہاں اپنے تیرتھوں کا ذکر کیا ہے وہاں بہت سی تیرتھ گاہوں کے نام گنائے ہیں جن میں سے کچھ تو بہت مشہور ہیں لیکن کچھ ایسے غیر معروف نام بھی آئے ہیں جنھیں اس طرف (یعنی ممالک متحدہ آگرہ واودھ) کے لوگ کم جانتے ہیں مثلاً نگر کوٹ[1] اور بال ناتھ[2] کا ٹیلہ

اس تفصیل سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ ملک محمد نے جغرافیے کی کتنی غلطیاں کی ہیں لیکن ان کی معلومات رسم ورواج زمانہ کا لحاظ کرتے ہوئے بہت تھی بلکہ بعض بعض مقامات کی تو ایسی تفصیلات اُن کو معلوم تھیں جو کسی واقف کار ہی کو ہو سکتی ہیں۔

---

[1] نگر کوٹ کانگڑے میں ہے جہاں لوگ جوالا دیوی کی زیارت کی غرض سے جاتے ہیں۔

[2] بال ناتھ کا ٹیلہ بھی پنجاب میں ہے۔ سندھ اور جہلم کے درمیان جو نمک کے پہاڑ پڑتے ہیں اسی کے اندر یہ ایک اونچی پہاڑی ہے جس میں بال ناتھ نام ایک جوگی کی کٹی ہے۔ یہاں سادھو کثرت سے جاتے ہیں۔

مرزا پور میں بھی اس نام کی ایک کٹی ہے لیکن غالباً جائسی کا مطلب پنجاب والی کٹی ہی سے ہوگا کیونکہ اس کی اہمیت مرزا پور والی کٹی سے کہیں زیادہ ہے۔

پنجاب والے بال ناتھ کے ٹیلے کا ذکر آئین اکبری میں صوبۂ لاہور کے بیان کے سلسلے میں بھی آیا ہے۔

۱۰۔ تاریخ ملک صاحب کی تاریخی معلومات جغرافیے کے علم سے زیادہ تھی اور اس کا ثبوت خود پدماوت ہے۔

یہ درست ہے کہ پدماوتی اور ہیرامن توتے کی کہانی ہندستان اور خاص کر اودھ میں بہت مشہور ہے اور پدماوت کی کہانی اسی کے مطابق ہے فرق صرف اتنا ہے کہ کہانی کہنے والے راجا اور بادشاہ کا نام نہیں لیتے اس کے بجائے غیر متعیّن طور پر "ایک راجا تھا" یا "ایک بادشاہ تھا" کہتے ہیں اور ملک محمد جائسی نے نام لے کر کہانی میں تاریخی جان ڈال دی ہے۔ زمانہ گزرنے سے کہانی تاریخ اور تاریخ کہانی ہو جاتی ہے۔ یہی حال پدمنی کے قصّے کا ہوا۔ اس قصّے میں چتّور، رتن سین، علاؤالدین اور گورا بادل وغیرہ ناموں کا استعمال شاعر جائسی کے اس علم کا یقین دلاتا ہے کہ یہ واقعہ کس بادشاہ کے زمانے اور کس مقام کا ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ پدمنی کس کی رانی تھی اور کس راجپوت نے لڑائی میں سب سے زیادہ جواں مردی کا اظہار کیا تھا اس کے علاوہ علاؤالدین کی اور لڑائیوں کا بھی پتہ اُن کو تھا۔ مثلاً دیوگری[1] کا حملہ اور قلعۂ رنتھمبور کا محاصرہ۔ تاریخی اعتبار سے اُن سب حملوں کا اور لڑائیوں کا ذکر نظم میں نہایت عمدگی کے ساتھ ہوا ہے۔ علاؤالدین کے عہد میں مغلوں کے کئی حملے ہوئے تھے

---

[1] دیوگری پر علاؤالدین نے ۱۲۹۴ء میں حملہ کیا تھا جو اُس کے چچا سلطان جلال الدین کا عہد تھا۔ قلعۂ رنتھمبور پر اُس نے بادشاہ ہونے کے چار سال بعد ۱۳۰۰ء میں چڑھائی کی تھی لیکن اس مرتبہ وہ اسے نہ لے سکا تھا۔ دوسرے سال ۱۳۰۱ء میں قلعہ فتح ہوا اور مشہور سپہ سالار "ہمیر" مارا گیا۔ یہ دونوں حملے چتور کی فتح سے پہلے کے ہیں جو ۱۳۰۳ء میں ہوئی۔

جن میں سب سے زبردست حملہ ۱۳۰۲ء میں ہوا- یہی سال تھا جبکہ علاؤالدین نے چتّوڑ پر چڑھائی کی تھی اب ملاحظہ فرمائیے مغلوں کے اس حملہ کا ذکر جائسی نے کس طرح کیا ہی-

یہ ودھ ڈھیل[1] دینھ تب تائیں ۔ دلی تیں اردا سیں آئیں
پچھیوں ہروے[2] دینھ جو پیٹھی ۔ سو اب چڑھا سونھ کے دیٹھی
جنھ بھوئیں ماتھ گگن تیھ لاگا ۔ تھانے اُٹھے، آؤ سب بھاگا
اُہاں ساہ چتور گڑھ چھاوا ۔ اِہاں دیس اب ہوئی پراوا

ترجمہ} اس لڑائی میں اس طرح ڈھیل پڑی کہ دلی سے عرضداشتیں آنے لگیں کہ مغل جو ہمیشہ بھاگتے تھے اب انھوں نے چڑھائی کی ٹھانی ہی جس کا سر ہمیشہ زمین پر رہتا تھا اس نے سر اُٹھایا ہی شاہ نے تو وہاں چتّوڑ میں چھاونی ڈالی ہی اور یہاں اپنا ملک غیر کا ہوا جاتا ہی۔

راجپوتوں کے مختلف خاندانوں کے بہت سے نام ان کو

---

[1] यहि विधि ढील दीन्ह तब ताइं।
दिल्ली तें अरदासैं आईं॥

पछिउं हरवे दीन्हि जो पीठी।
सो अब चढ़ा सौहं कै दीठी॥

जिन्हू भुंह माथ गगन तहि लागा।
थाने उठे आव सब भागा॥

उहां साह चित वर गढ़ छावा।
इहां देस अब होइ परावा॥ (पदमावत)

[2] ملک صاحب نے مغلوں کے ملک کا نام "ہروے" رکھا ہی۔

معلوم تھے لیکن ان کو اس کا ٹھیک علم نہیں تھا کہ کس خاندان کا راجا کس جگہ حکومت کرتا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ رتن سین[1] کو چوہان نہ لکھتے کیونکہ جاننے والے جانتے ہیں کہ چتّور میں راول کے وقت سے اب تک ششودھیا کی حکومت ہے۔ نہ کہ چوہانوں کی۔

۱۱۔ نجوم پدماوت میں تاریخ، جغرافیہ، عربی، فارسی وغیرہ کے علاوہ کچھ ایسی باتوں کا بھی ذکر آیا ہے جو علم کیمیا، علم نجوم، جنسی معلومات اور دیگر علوم سے متعلّق ہیں مگر عنوان بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام علوم میں تو ان کو کافی دستگاہ نہ تھی البتہ علم نجوم میں اُنھیں خاصی مہارت تھی۔

رتن سین کے سنہل دیپ روانہ ہونے سے پہلے تاریخ کی نحوست اور سعادت کے متعلق جو نقشہ انھوں نے پیش کیا ہے وہ مفصّل بھی ہے اور علم جوتش کے مطابق بھی۔ ان کی اس مقام کی اکثر چوپائیاں زبان زد عام ہیں۔

پدماوت۔ سوم[2] سینچر پُرب نہ چالو منگل بدھ اُتر دِس کالو

ترجمہ } دوشنبہ اور ہفتے کو پورب کی طرف نہ جانا چاہیے اور سہ شنبہ اور چہار شنبہ کو اُتر کی طرف جان کا خطرہ ہے۔

---

[1] رتن سین کو جب سولی دینے کے لیے جاتے ہیں تب بھاٹ اس کا تعارف راجہ گندھر سین سے اس طرح کرتا ہے۔

جنبو دیپ چتور گڑھ دیا چتر سین بڑ تھائے نریا
رتن سین یہ تاکر بیٹا کل چوہان جائے نا میٹا

ترجمہ } ہندستان میں چتور گڑھ ایک مقام ہے چتر سین وہاں کا ایک بڑا حاکم تھا یہ رتن سین اسی کا بیٹا ہے چوہان خاندان مٹایا نہیں جاسکتا۔

[2] सोन सनीचर पुरुब न चालू।
मंगल बुद्ध उत्तर दिसि कालू॥

علم نجوم کے عربی، فارسی ناموں کے مترادف ہندی الفاظ بھی اُن کو معلوم تھے جو مشکل بات ہی۔ پدماوت میں ستارہ سہیل[1] کا ذکر انھوں نے "سوہل" یا سہیل کے نام سے اکثر مقاموں پر کیا ہی اور انھیں مواقع پر کیا ہی جس پر ہندی شاعری کو "اگست[2]" استعمال کرنا چاہتے یعنی بارش کے اختتام اور جاڑے کے شروع کا اظہار۔

مثلاً[3]
بچھرتا جب بھیدے سو جانے جیہہ نیہہ
سکھک سُہیلا اُگاوے دُکھ جھرے جمی مینہہ

اسی طرح ایک مقام پر اور سہیل کا نام استعمال کیا ہی رتن سین کو دلی سے چھڑا کر جب گورا بادل چلا تب شاہی فوج نے اس کا تعاقب کیا ہی اس وقت گورا کے کہنے سے بادل تو رتن سین کو لے کر چتور کی طرف روانہ ہو جاتا ہی اور گورا سپاہیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے پلٹ

---

[1] سہیل ایک ستارے کا نام ہی جس کے نکلنے سے تمام کیڑے مکوڑے مرجاتے ہیں۔ سہیل کا ذکر اردو، فارسی کی شاعری میں اکثر آیا ہی۔

[2] ہندی شاعر "اگست" سے برسات کے اختتام اور گلابی جاڑے کے شروع کا اظہار کرتے ہیں جیسا کہ تلسی داس نے ایک جگہ کیا ہی۔

اُدت اگست پنتھ جل شوشا   جمی لو بھیں سو کھے سنتوشا

ترجمہ: ستارہ اگست کے طلوع ہونے پر راستوں کا پانی خشک ہو گیا اسی طرح جیسے حرص اطمینان کو فنا کر دیتی ہی۔

[3]
बिछुरता जब भेदे सो जाने जि हिनेह ।
सुक्ख-सुहेला उगावे दुःख झरे जिमि मेह ॥

(पदमावत)

پڑتا ہے اور کہتا ہے۔

(پدماوت)، سوہل[1] جیسں گگن اُپرا ہیں میگھ گھٹا مینہہ دیکھ بلائیں

ملک محمد جائسی نے سہیل کے ہندی نام اگست کا بھی استعمال کیا ہے جس سے ان کا ہندی و عربی کے مترادف ناموں کا علم واضح ہوتا ہے۔

(پدماوت) اُئے[2] اگست ہست جب گاجا نیر گھٹے گھر آویں راجا

امیٹھی کے راجا کے یہاں سے خفا ہو کر پلٹنے اور ساعت پرستش بتانے کا قصہ پہلے ہی آچکا ہے اس سے صرف یہی اندازہ نہیں ہوتا کہ اُن کو نجوم سے بہرہ تھا بلکہ ان کے کمال کا بھی پتہ چلتا ہے۔

۱۲۔ عام معلومات

یہ جو کچھ کہا گیا وہ ان باتوں کے متعلق تھا جو کتابی علوم کہے جاتے ہیں یعنی جنھیں انسان کتاب کے ذریعے سے حاصل کر سکتا ہے لیکن ان کے علاوہ اور بہت سی ایسی چیزوں سے بھی ان کو واقفیت تھی جن کا علم خارجی باتوں کے دیکھنے اور سننے سے تعلق رکھتا ہے۔ گھوڑوں اور کہاروں کے مختلف قسموں کا ذکر پُرانے زمانے کے لباس کا بیان (پدماوتی اور رتن سین کے ضمن میں) اور کچھ ان پُرانے رسم ورواج کا تذکرہ بھی پدماوت میں آیا ہے جن کو اُس وقت لوگ جانتے ہوں گے مثلاً

---

[1] सोहिल जैस गगन उपराहीं।
मेघ घठा मंहिं देखि बिलाही॥

[2] उए अगस्त हसित जब गाजा।
नीर घटे घर आवहिं राजा॥

"چتر بھنگ"[1] یا "بیر پوجا"[2] کی رسم یا یہ رواج کہ بارش کے بعد تمام کام شروع کیے جائیں۔

پُرانے زمانے میں بڑی رانی کو "پٹ[3] رانی" کہتے تھے چنانچہ ملک صاحب نے بھی یہی کہا ہی

۱ے اس رسم کا ٹھیک پتہ نہیں چلتا کچھ لوگ چندن یا رنگ سے تصویریں بنانے کو چتر بھنگ کہتے ہیں لیکن قیاس اغلب یہ ہی کہ سونے یا چاندی کے باریک ورق کے ٹکڑے ہوتے تھے جنھیں مانگ کے پاس سے مُنہ تک ایک سیدھ میں چپکاتے تھے آج کل اس کا شایبہ رام لیلا میں ملتا ہی جہاں لوگ تارے اور چمکدار چیزیں مُنہ پر لگاتے ہیں۔

۲ے بہادر اور نامور فرزند کی عزت اہل ہند کی نظر میں اس درجہ تھی کہ رفتہ رفتہ عبادت اور پرستش کی حد کو پہنچ گئی تھی۔ ملک محمد نے اس رسم کا ذکر بڑی آن بان سے کیا ہی جس وقت بادل کے ساتھ راجا رتن سین چھوٹ کر آتا ہی تو اس وقت پدماوتی بادل کی آرتی اُتارتی ہی اور اس کی پوجا کرتی ہی۔

(پدماوت) پرسی پائیں راجا کے رانی ۔ پنی آرتِ بادل کنھ آنی

پوجے بادل کے بھج دنڈا ۔ تُری کے پانوں داب کر کھنڈا

परसि पायं राजा के रानी। पुनि आरति बादल कंह आनी ॥

पूजे बादल के भुज दंडा। तुरी के पांव दाब कर खंडा ॥

۳ے پاٹ مہادیئی ہیئے نہ ہارو ۔ سمجھ جیو چت چیت سنبھارو

पाट महादेइ ! हिये न हारू।

समुझि जीउ, चित चेत संभारू ॥

ترجمہ} "پاٹ مہادیئی" دل چھوٹا نہ کرو سمجھ بوجھ کر دل کو سنبھالو۔

ان سب باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ملک محمد کا علم صرف کتاب یا انھیں باتوں تک محدود نہ تھا جو ان کے زمانے میں تھیں بلکہ سادھوؤں فقیروں اور بزرگوں کی صحبت کی بدولت وہ بہت سی ایسی باتوں سے واقف تھے جنھیں ہر شخص نہیں جان سکتا۔

اخلاق و عادات ملک صاحب کے حالات جس تاریکی میں پڑے ہوئے ہیں ان کا اندازہ کرتے ہوئے ان کے عادات وخصایل اُن کے اخلاق اور برتاؤ کے متعلق سوائے اس کے کہ خود ان کے تصنیف سے اخذ کیا جائے کوئی دوسرا ذریعہ معلومات کا بہم نہیں پہنچ سکتا۔

شاعر جائسی سنجیدہ مزاج، فقیر منش، تنہائی پسند اور خود دار تھے نہ بادشاہ کا دربار اُن کو مرعوب کر سکتا تھا نہ راجا کا جاہ و حشم۔ راجہ امیٹھی کے محل میں داخل ہونے سے جب دربانوں نے اُن کو منع کیا اس وقت کا طرز عمل ملک صاحب کی خودداری کے علاوہ اُن کے حسّاس ہونے کا بھی پتہ دیتا ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ باوجود انتہائے ریاضت اور خود فراموشی کے اُن میں غصّہ موجود تھا اپنے قاتل کے ساتھ مہربانی کا سلوک بتاتا ہے کہ اُن کا مسلک " با دشمناں مدارا" سے بھی بلند تر تھا۔ "زباندان محبت" ہونے کے اعتبار سے رنگ روپ، مذہب وملّت کا فرق ان کے نزدیک بالکل نہ تھا اور ان کے کمال اور اخلاق نے لوگوں کو اُن کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ باوجود اس کے کہ وہ اپنے زمانے میں پہنچے ہوئے فقیروں میں شمار کیے جاتے تھے لیکن ان کے دل میں انسانی محبت اور خدائی عشق نے غرور کے لیے جگہ

نہ چھوڑی تھی۔ اپنے اثر سے فایدہ اُٹھانا چاہتے تو کبیر داس کی طرح یہ بھی اپنا ایک نیا مذہب جاری کر دیتے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ کبیر کی طرح نہ تو انھوں نے یہ کہا کہ اس چادر کو دیوتا (سر) آدمی (نر) فقیر (منی) سب نے اوڑھ کر میلا کر دیا ہو لیکن میں نے "جیوں کی تیوں رکھ دین چدریا" اور نہ ان کی طرح جمہور کی رائے کو بے حقیقت سمجھا کبیر نے یہ بتایا کہ باطن میں سب ایک ہیں لیکن ملک محمد نے تو یہ بتایا کہ تمام چیزیں ظاہر و باطن دونوں میں ایک ہیں درحقیقت اِن میں کوئی فرق نہیں۔

ملک صاحب کے اخلاق کا کچھ اندازہ اس سے بھی ہو سکے گا۔ کہ باوجود اس کے کہ یہ کبیر سے بالکل الگ راستے پر چل رہے تھے لیکن پھر بھی انھوں نے کبیر کا ذکر عزت کے ساتھ کیا ہو۔

بدیہہ گوئی بدیہہ گوئی کی صرف ایک مثال ملتی ہو۔ ان کے کھیت کے قریب کسی دوسرے کا کھیت تھا۔ اس کی بیوی دوپہر کو اُس کے کھانے کے لیے گرم گرم بھُنے چنے لیے جا رہی تھی جب وہ شاعر جائسی کے پاس سے گزری تو اُس کی خوشبو اُنھیں محسوس ہوئی برجستہ ملک صاحب نے فرمایا

"ایس جرے تو کیس نہ مہکے"

ترجمہ۔ اس طرح جلے تو کیسے نہ مہکے۔ یعنی اس طرح جب اپنے آپ کو جلاتا ہی تب اس کی خوشبو تمام عالم میں پھیلتی ہی۔

کچھ لوگ اس واقعے کو یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص اُن کا نام سُن کر اُن کی تلاش میں جائس آیا تھا، جب یہ کھیت سے ہَل

کندھوں پر رکھے بیلوں کی جوڑی ہانکتے واپس آرہے تھے تو وہ شخص بھڑبھونجے کی دکان کے قریب اُن کو ملا۔ اُنھوں نے قیافے سے معلوم کرلیا کہ یہ میری ہی تلاش میں ہی۔ یہ معلوم کرتے ہی معاً اُن کے دل میں یہ خیال گزرا کہ ای خدا ئیں نے تیری عبادت گزاری میں اپنے کو اتنا جلا دیا ہی کہ اس کی خوشبو دُور دُور پھیل گئی ہی اور اُنھوں نے یہ پورا شعر پڑھا۔

جیسے بھاڑ بے چھنا دہکے ایس جرے تو کیس نہ مہکے

اجنبی شخص صورت شکل سے تو اُن کو جانتا نہ تھا۔ دوسرے اُن کی صورت اور ہئیت کذائی کو دیکھ کر وہ اُن کا اور اپنے ذہنی ملک محمد کا تطابق بھی نہ کر سکتا تھا۔ جب اُس نے یہ شعر سُنا تو بیچین ہوگیا اور نام پوچھ کر اپنے اشتیاق کا اظہار کیا۔

خصایص اس کے علاوہ ملک صاحب کے اور خصایص کیسے تھے اس کا کچھ اندازہ پدماوت کے اُن مقاموں سے ہوسکے گا جہاں مصنّف نے ضمناً کسی چیز کے متعلّق رائے زنی کی ہی مثلاً

خیرات دھن جیون اوتا کر ہیا اونچ جگت منہہ جا کر دیا

ترجمہ ۔ دولت، دل اور زندگی اُس کی ہیں جو خیرات کرے۔

دیا جو جپ تپ سب اپراہیں دیا برابر جگ کچھو ناہیں

ترجمہ ۔ خیرات تمام عبادت سے بڑھ کر ہی۔ اس سے بڑھ کر دنیا میں

धीन जीवन औताकर हिया।
ऊंच जगत मंह जाकर दिया॥

(पदमावत)

کچھ نہیں۔

ایک دیا[۱] تے دس گن لہا دیا دیکھ سب جگ مکھ چہا

ترجمہ۔ خیرات کا بدلا دس گُنا ملتا ہی۔ مخیّر کا مُنہ دنیا تکتی ہی۔

دیا[۲] کرے آگے اُجیارا جہاں نہ دیا[۳] تہاں اندھیارا

ترجمہ۔ چراغ (خیرات) آگے آگے روشنی کرتا ہی۔ جہاں چراغ (خیرات) نہ ہو وہاں اندھیرا رہتا ہی۔

دیامندربس کرے[۴] اجورا دیانا ہیں گھر موسین چورا

ترجمہ۔ چراغ (خیرات) مکان میں رات کو اُجالا کرتا ہی۔ اگر چراغ (دیا) نہیں تو چور چُرالے جائیں گے۔ یہ بھی مطلب ہو سکتا ہی کہ اگر خیرات نہ کروگے اور جوڑ جوڑ کر رکھوگے تو چور چُرالے جائے گا۔

صفحہ ۶۷ ۔ دیا जो जप तप सब उपराहीं।
दिया बराबर जग कछु नाहीं ॥ १ ॥

۱ एक दिया ते दसगुन लहा।
दिया देखि सब जग मुख चहा ॥ २ ॥

۲ दिया करै आगे उजियारा।
जहां न दिया तहां अंधियारा ॥ ३ ॥

۳ لفظ "دیا" کے شاعرانہ استعمال سے فایدہ اٹھا کر دو مستقل مفہوم شعر میں پیدا کر دیے ہیں جو لفظ "دیا" کو خیرات اور چراغ دونوں معنوں میں الگ الگ استعمال کرنے سے واضح ہو جاتے ہیں۔

۴ दिया मंदिर बसि करै अजोरा।
दिया नाहिं घर मूसहि चोरा ॥ ४ ॥

۲۔انکسار

یہی سینت بہوری جوجھ نہیں کرئے ۱
کھڑک دیکھ پانی ہوے ڈھرئے

ترجمہ۔ لڑائی جھگڑا نہ کیجیے بلکہ تلوار دیکھ کر پانی کی طرح منکسر ہو جائیے۔

پانی کاہ کھڑک کی دھارا ۲ لوٹ پان ہوئے سوئی جو مارا

ترجمہ۔ تلوار کی دھار پر پانی ہی تو ہی جو لوٹ کر مارتا ہی۔

پانی سینت آگ کا کرئی ۳ جائے بجھائے جو پانی پڑتی

ترجمہ۔ پانی کے سامنے آگ کیا کر سکتی ہی۔ پانی اُسے بجھا دے گا۔

۳مصیبت

دُکھ جارے، دُکھ بھونجے، دُکھ کھووے سب لاج ۴
گاجہ چاہی ادھک دکھ۔ دکھی جانی جیہ باج

ترجمہ۔ مصیبت جلاتی ہی۔ مصیبت بھونتی ہی۔ مصیبت سب شرم کھو دیتی ہی۔ اور احتیاج سب سے بڑی مصیبت ہی۔

۴۔بُرائی کے بدلے بھلائی

منٛدہ بھل جو کرے بھل سوئی ۵
انتہہ بھلا بھلے کر ہوئی

۱
यहि सेंति बहुरि जूझि नहीं करिए। खड़ग देखि पानी होइ ढरिए ॥

۲
पानी काह खड़ग की धारा। लौटि पानि होइ सोइ जो मारा ॥

۳
पानी सेंति लागि का करई।
जाइ बुझाय जौ पानी परई ॥

۴
दुख जारे दुख भूंजै, दुख खोवे सब लाज।
गाजहि चाहि अधिक दुख, दुखी जान जेहिवाज ॥

۵
मंदहि भल जो करि भल सोई।
अंतहि भला भले करि होई ॥

ترجمہ۔ بُرے کے ساتھ بھلائی کرنا بھی اچھا ہی (کیونکہ) آخر میں بھلا کرنے والے ہی کا بھلا ہوتا ہی۔

شترو[۱] جو بش دئیے چاہیں مارا دیجے لون جان بش ہارا

ترجمہ۔ دشمن جو زہر دے کر مارنا چاہتا ہی اُسے (یعنی دشمن کو) بجائے زہر کے نمک دیجے۔ زہر دُور کرنے والا سمجھ کر۔

بش[۲] دینھے بشہر ہوئے کھائی لون دئے ہوئے لون بلائی

ترجمہ۔ دشمن کے دیے ہوئے زہر کو سانپ بن کر کھالو۔ دشمن کو بجائے زہر کے نمک دینے سے زہر دُور ہو جائے گا۔ (اس کے بدلے میں دشمن کو) تمھارا نمک دینا اُس زہر کی دوا بن جائے گا۔

مارے[۳] کھڑگ کھڑگ کر لیئی مارے لون نائے سر دیئی

ترجمہ۔ تلوار سر الگ کرکے مارتی ہی اور نمک بغیر سر کاٹے ہوئے۔

ملک صاحب نے جس سادگی اور جس ادا کے ساتھ بُرائی کے بدلے بھلائی کرنے کی نصیحت فرمائی ہی وہ اُنھیں جیسے اُستاد کا کام تھا۔ اس نصیحت میں اگر بیان کی دل کشی اور انداز بیان کی سلاست کے سوا اور کچھ نہ بھی ہو تب بھی یہ حصّہٴ نظم آپ اپنی نظیر ہی لیکن ان اوصاف

۱۔ शत्रु जो विष देइ चाहैं मारा।
दीजय लोन जानि विष हारा॥

۲۔ विष दीन्हे विसहर होय खाई।
लोन दिये होय लोन विलाई॥

۳۔ मारे खड़ग खड़ग कर लेई।
मारे लोन नाइ सिर देई॥ (पदमावत)

کے ساتھ ساتھ جو بے ساختگی اس میں پائی جاتی ہے اور جن دلیلوں کے ساتھ ملک صاحب نے اس عمل نیک کی دعوت دی ہے وہ اس خیال کو بلند تر کر دیتی ہے۔ اس حصۂ نظم سے اور زیادہ لطف اندوز ہونے کے لیے اس کو کسی قدر وضاحت کے ساتھ بیان کرنا ضروری ہے۔

بُرے کے ساتھ بھلائی کرنا بھی اچھا ہے۔ کیونکہ آخر میں بھلا کرنے والے ہی کا فایدہ ہے اور اُسی کا بھلا ہوتا ہے۔ ہر بھلائی کا بدلا اچھا ہوتا ہے خواہ وہ بُرے کے ساتھ کی گئی ہو یا اُس سے کسی بھلے کو فایدہ پہنچا ہے۔ اگر تمھارا دشمن تمھارے درپۓ آزار ہو تو نقصان پہنچانے کے بجائے تم اُس سے بہ مہربانی پیش آؤ کہ

ع: نہ برد قہر نرم را تیغ تیز

دشمن اگر زہر دے تم اُس کے صلے میں نمک دو جو زہر دُور کرنے والا ہے۔ یہی اس زہر کے لیے تریاق کا کام دے گا یعنی تمھارا فایدہ پہنچانا تمھارے نقصان کی تلافی کر دے گا کیونکہ آیندہ کے لیے خطرے کا دروازہ تم پر بند ہو جائے گا۔ تمھارا تلطّف اس کی شرمندگی کا باعث اور اُس کے باز آنے کا سبب بن جائے گا۔ تلطّف میں بڑی طاقت ہے اس کا وار تلوار سے بھی بڑھ کر ہے۔ تلوار تو سر کاٹ کر سزا دیتی ہے اور تلطّف بغیر سر کاٹے ہوئے۔

۵۔ جوانمردی

ساہس جہاں سدھ تہنہ ہوئی[1]

ترجمہ۔ جہاں ہمت ہے وہاں سب کام پورے ہو جاتے ہیں۔

---

[1] साहस जहां सिद्ध तहं होई। (पदमावत)

۶۔ دوٗلت

درب^۱ تیں گرب کرے جو چاہا
درب تیں دھرتی سرگ بساہا

ترجمہ۔ دولت سے زمین، عزّت اور جنّت سب کچھ مل سکتی ہیں۔

درب^۲ تیں ہاتھ آؤ کیلاسو درب تیں اچھری چھانڑنہ پاسو

ترجمہ۔ دولت سے "کیلاس" اور علم ہاتھ آجاتے ہیں اور کوئی بات رہ نہیں سکتی۔

درب تیں^۳ نرگن ہوئے^۴ گن ونتا درب تیں کُوج ہوئے رُوپ ونتا

ترجمہ۔ دولت سے کم سواد اہل علم ہو جاتے ہیں اور دولت بدصورتوں کو خوبصورت بنا دیتی ہے۔

درب^۵ رہے بھوئیں دیبے للارا اس من درب دئے کو پارا

---

۱ दरब ते गरब करै जो चाहा।
दरब ते धरती सरग बसाहा॥

۲ दरब तें हाथ आवै कैलासू।
दरब ते अछरी छाँड न पासू॥

۳ दरब ते निरगुन होइ गुनवंता।
दरब ते कुवुज होय रूपवन्ता॥

۴ فارسی کا یہ شعر دولت کے متعلق بہت مشہور ہے۔

ای زر تو خدائی ولیکن بخدا ستار عیوب وقاضی الحاجاتی

ان دو مصرعوں میں شاعر نے وہ کچھ کہہ دیا ہے جس کے ادا کرنے کے لیے ملک صاحب کو آٹھ مصرعے بھی ناکافی ہوئے۔

۵ दरब रहे भुइं, दिये लिलारा। उस मन दरब देइ को पारा॥

ترجمہ۔ زمین میں دولت گڑی رہنے سے بھی چہرہ چمکتا ہے ان صفتوں کی دولت کون ہاتھ سے دیتا ہے۔

سانٹھ ہوئی جیہہ تیہی سب بولا نسنٹھ جو پرش پات جمی ڈولا

ترجمہ۔ جس کے پاس پیسے ہیں اُس کی بات ہر ایک پوچھتا ہے اور جس کے پاس کچھ نہیں وہ پتّے کی طرح مارا مارا پھرتا ہے۔

سانٹھہ رنگ چلے جورائی نسنٹھ راد سب کہہ بورائی

ترجمہ۔ جس کے پاس دولت ہوتی ہے وہ ہاتھی کی طرح جھوم کر چلتا ہے اور بغیر پیسے کے راجا کو لوگ پاگل کہتے ہیں۔

سانٹھہ اوگرب تن پھولا نسنٹھہ بول بدھ بل بھولا

ترجمہ۔ دولت کے باعث بدن استغنا سے پھول جاتا ہے اور بغیر پیسے والے کی عقل غایب ہو جاتی ہے۔ نہ طاقت گفتار باقی رہتی ہے نہ یار آئے کار۔

سانٹھہ جاگی نیند نس جائی نسنٹھہ کاہ ہوئے اونگھائی

---

۱ सांठि होय जहि तेहि सब बोला।
निसठ जो पुरष पात जिमि डोला॥

۲ सांठि हि रंक चलै भौराई।
निसठ राव सब कह बौराई॥

۳ सांठिहि आव गरब तन फूला।
निसंठहि बोल बुधिबल भूला॥

۴ सांठहि जागी नीद निशि जाई।
निसठहि काह होइ औंघाई॥

ترجمہ۔ جس کے پاس پیسے ہیں اُس کی رات چین سے گزرتی ہے اور مفلس کو اونگھ بھی نہیں آتی۔

ساٹھہ دشٹ جوت ہوئے نینا نسنٹھ ہوئے مکھ آو نہ بینا[1]

ترجمہ۔ رُپے سے آنکھوں میں روشنی آتی ہے اور بغیر پیسے کے مُنہ سے آواز نہیں نکلتی۔

پدماوت کے ان اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک محمد خیرات کو عبادت سے بڑھ کر سمجھتے تھے اور منکسر مزاجی اور بدی کے بدلے نیکی کرنے کو کامیابی کا راز، مال و دولت کی جو تعریف ملک محمد نے کی ہے وہ کسی بادشاہ یا امیر کی خوشامد کی غرض سے نہ تھی بلکہ خود لفظ پکارتے ہیں کہ وہ دولت کی وہی تعریف کر رہے ہیں جس کی وہ مستحق ہے۔ چونکہ وہ خود ایک معمولی حیثیت کے خاندان میں پیدا ہوئے تھے اور بچپن ہی میں والدین کے مرجانے سے رنج اٹھائے ہوئے تھے اس لیے جو انھوں نے لکھا وہ تجربہ معلوم ہوتا ہے اور صورت حال کو دیکھتے ہوئے اس کے ماننے میں کوئی پس و پیش نہیں کیا جا سکتا کیونکہ "یہ آپ بیتی" ہے اور اگر آپ بیتی نہ سمجھا جائے تب بھی دولت و ثروت کے جو کرشمے ہماری نظروں کے سامنے آج بھی آتے ہیں وہ ملک محمد کے کلام کی تائید کرتے ہیں۔ اس موقعے پر اس بات کا بتا دینا ضروری ہوتا ہے کہ خود ملک محمد کو دولت مند بننے کی خواہش نہ تھی بلکہ انھوں نے بحیثیت ایک فلسفی کے دنیا کی حالت بیان کی ہے۔

---

[1] साँठहि दिस्टि जोति होइ नैना।
निसँठ होय मुख आव न बैना॥

وفات خزینۃ الاصفیا[۱] اور رسالہ شیخ عبدالقادر جائسی[۲] دونوں میں ملک صاحب کا سنہ وفات ۱۰۴۹ھ ۱۶۳۹ء درج ہے جو شاہجہاں کا عہد تھا۔

خزینۃ الاصفیا میں صاحب معراج الولایت[۳] کے حوالے سے یہ بھی

ملک صاحب کی وفات کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسی سال واقع ہوئی جس سال وہ دربار میں بلائے گئے تھے۔ لیکن اس امر کے متحقق نہ ہونے کے سبب سے کہ وہ کب اور کس کے دربار میں بلائے گئے تھے۔ نہیں کہا جاسکتا کہ ملک صاحب نے کب وفات پائی۔

واجد علی شاہ (فرمانروائے اودھ) کے عہد میں ایک بزرگ گزرے ہیں قاضی سید عادل حسین ابن قاضی سید نصیر الدین جائسی ان کی یادداشت میں یہ لکھا ہوا پایا گیا ہے کہ ۵ رجب ۹۴۹ھ شہادت "ملک محمد" ممکن ہے کہ قاضی صاحب کی لکھی ہوئی تاریخ صحیح ہو لیکن اگر اس مسئلے میں قیاس کو ذرا بھی گنجایش ہو تو صاحب معراج الولایت کا بیان بہ اعتبار قدامت زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے اور مولوی غلام سرور مرحوم (لاہوری) اور مولوی عبدالقادر مرحوم (جائسی) کے اس معاملے میں متحد القول ہونے کی بنا پر ملک صاحب کا سنہ وفات ۱۰۴۹ھ ہی متعین ہوتا ہے یہ خوف کہ ایسا کرنے سے ملک صاحب کی عمر زیادہ ہو جاتی ہے بے معنی بھی ہے اور مضحک بھی۔

[۱] چو از دنیا محمد نزد حق رفت — بہ سال رحلت آں شاہِ عالی
یکے فضل و کمالِ اولیا خواں — دگر فرما محمد شیخ والی ۱۰۴۹ھ

تاریخ از مصنف خزینۃ الاصفیا اعنی مولوی غلام سرور صاحب لاہوری

[۲] بعد شاہجہاں در سال یک ہزار چہل و نہ وفات یافت (رسالہ شیخ عبدالقادر)

[۳] صاحب معراج الولایت فرمود کہ وے تا آخر خلافت اکبر شاہ بقید حیات بود اما حال وفاتش در کتاب خود نفرمودہ۔ (خزینۃ الاصفیا)

لکھا ہی کہ ملک صاحب اکبر بادشاہ کی خلافت کے آخر تک زندہ تھے۔ لیکن انھوں نے وفات کا کوئی سنہ نہیں دیا۔

ان بیانات کی بنا پر ملک صاحب نے گویا ۱۴۹ برس کے سن میں وفات پائی۔

ایک تاریک شب کو جبکہ ملک صاحب ذکر اسدی[1] میں مشغول تھے۔ امیٹھی کے ایک بہلیے نے ملک کی آواز کو شیر کی آواز سمجھ کر آواز پر گولی لگائی اور وہ گولی ملک صاحب کی پیشانی پر لگی اور یہ جاں بحق تسلیم ہو گئے۔ اس حادثے کی تفصیل یہ بتائی جاتی ہی کہ جب امیٹھی کا راجا ملک صاحب سے ملنے اُن کی خانقاہ میں آتا تھا تو اس کے ساتھ یہ بہلیا (تفنگچی)، بھی ہوتا تھا اور اس کی خاطر ملک صاحب بہت کرتے تھے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ کو سب سے زیادہ یہی بہلیا عزیز ہی شاعر جائسی نے جواب دیا کہ "یہ میرا قاتل ہی" یہ سُن کر عجیب خاموشی خانقاہ پر چھا گئی۔ بہلیے نے کہا کہ قبل اس کے کہ مَیں اپنے دوزخ میں جانے کا سامان کروں مجھ کو قتل کر دیا جائے۔ راجا نے بھی اس کو قتل کرنے کی اجازت چاہی مگر ملک صاحب نے دونوں کو منع کیا اس کو جان دینے سے اور راجا کو جان لینے سے۔ لیکن راجا نے احتیاطاً اس کی بندوق ضبط کر لی اور سلحہ خانے کے داروغہ کو حکم دیا کہ خبردار اس کو کبھی بندوق نہ دی جائے۔ راجا کے حکم پر فوراً عمل درآمد شروع ہو گیا بندوق داخل کرالی گئی مگر اس کے بعد

---

[1] ذکر اسدی۔ ذکر کے لفظی معنی ہیں یاد کرنا یہ ایک طریقہ ریاضت و عبادت کا ہی۔ مختلف گروہوں کے فقیروں، درویشوں کا، جس میں شیر کی سی آواز پیدا ہوتی ہی۔ اسی کو ذکر جہر یا ارہ بھی کہتے ہیں۔

بھی اُس کو محل کی محفلوں اور صحبتوں میں پہلا ہی سا درخور حاصل رہا۔ ایک روز رات کو محل سے گھر جانے میں دیر ہوگئی۔ رات بھی اندھیری تھی۔ اُس نے داروغہ سے کہا کہ رات بھر کے لیے بندوق دے دو راستے میں گھنا جنگل پڑتا ہی۔ ممکن ہی کوئی جانور مل جائے۔ داروغہ نے اس میں مضایقہ نہ سمجھا اور بندوق بہیلیے کے حوالے کردی۔ جب بہلیا جنگل کے قریب پہنچا تو اُس نے شیر کے غُرّانے کی آواز سُنی۔ فوراً آواز پر نشانہ کیا۔ جو ملک کی پیشانی پر بیٹھا۔ آواز بند ہوگئی۔ بہلیا سمجھا کہ گولی لگ گئی، رات بھی زیادہ جاچکی تھی۔ وہ سیدھا اپنے گھر چلا گیا اور ملک صاحب کو ایسا زخم لگا کہ فوراً انتقال فرماگئے۔

اُدھر محل میں راجا نے جو محو راحت تھا خواب میں دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہی کہ تم یہاں آرام سے سو رہے ہو وہاں ملک صاحب کو بہیلیے نے مار ڈالا راجا فوراً بیدار ہؤا اور سرو پا برہنہ جنگل کی طرف دوڑا۔ خانقاہ کے قریب پہنچا تو ملک صاحب میں ذرا دم نہ پایا، ایک کہرام مچ گیا۔ محل میں سوگ شروع ہوگیا۔ تجہیز و تکفین کا سامان ہونے لگا۔

مزار رام نگر میں متّصل گڑھ امیٹھی محل سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر راجا نے اُن کا مزار بنوا دیا اور ایک قرآن خواں کو مقرر کردیا کہ تلاوت کیا کرے۔ اب البتہ مزار پر نہ کوئی قرآن پڑھتا ہی اور نہ ریاست ہی کچھ توجہ کرتی ہی۔ لوگوں کا بیان ہی کہ قرآن خواں کی علیحدگی ۱۹۱۳ء سے عمل میں آئی ہی اور اُسی وقت سے ریاست کی حالت میں تبدیلی شروع ہوچلی تھی اور اب ریاست سرکاری نگرانی میں ہی۔

ملک محمد جائسی کا مرتبہ ہندی ادب میں

قرونِ وسطیٰ کے ہندی ادب میں ملک محمد جائسی کا درجہ بہت بلند ہے۔ ایک زمانے میں تو یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے رزمیہ مثنوی لکھی ہے اس کے متعلق اب اختلاف آرا ہے لیکن پوربی ہندی (اودھی) کے نامور اہل قلم میں ان کی اولیت مسلّم ہے اوران کا شاہ کار پدماوت بذاتِ خود ایک مطالعہ ہے ممکن ہے ہندی قصّہ لکھنے والوں میں ملک صاحب سے پیشرو چند ممتاز ادیب ہوئے ہوں لیکن اتنا تو بغیر کسی شک کے کہا جاسکتا ہے کہ وہ سب سے پہلے بڑے مصنّف ہیں اور جو مثال انھوں نے پیش کی ہے اس کی تقلید ہندو اور مسلمان دونوں کرتے ہیں۔ اُن کا بیان اتنا ہی فطری ہے جتنی اُن کی زبان ٹکسالی اور تصنع سے پاک ہے۔ افسوس اس خدا ترس فقیر منجاں مرنج بزرگ کو دنیا نے بھلا دیا۔ جس شخص میں رواداری، اخلاق وسنجیدگی سبھی کچھ باتیں موجود تھیں اُس کی قدر اُس کے اخلاف نے نہ کی۔ لیکن یہ کوئی جائے تعجب نہیں۔ دنیا نے اکثر اور ہم ہندستانیوں نے عموماً اپنے جمود کا یونہی ثبوت دیا ہے۔

جس جماعت نے خود اپنے زبان کے شہنشاہ کی قدر ایک معمولی ادیب کے برابر بھی نہ کی ہو، جس کے سب سے بڑے ادیب کا کلام طباعت اور کتابت کے اعتبار سے تیسرے درجے کے شاعر کے مجموعۂ کلام سے بھی زیادہ کم حیثیت ہو۔ انیسؔ اور میرؔ کے مزاروں کی بوسیدہ فصیلیں اور اور اُن کی ناگفتہ بہ حالت جس فرقے کی بے حسی کا اعلان۔ بہ بانگ دُہل کر رہی ہو اُن کے افراد سے کیا امید کی جاسکتی ہے کہ وہ ملک محمد جائسی کے

کلام کو سراہیں گے یا اُس کا غایر مطالعہ کریں گے جن کا ناتا اُردو سے پھر بھی بہت دوُر کا ہی۔

البتّہ سر جارج گری یرسن ایسے ہندی ادیب اور نثار کی نظروں میں شاعر جائسی کا درجہ نامور شاعران ہند میں بہت بلند ہی اور اُس وقت تک بلند رہے گا جب تک ہندی ادب کا ایک بھی دلدادہ باقی ہی۔

۲۔ تصانیف

ملک صاحب کی تصانیف کے متعلق وہ روایت تو نقل کی ہی جاچکی کہ اُن کے سات لڑکوں کے بجائے ان کی چودہ[1] تصانیف یادگار رہیں گی لیکن لوگوں میں تعداد تصنیف کے بابت اختلاف ہی. کچھ بتاتے ہیں کہ سات تھیں، کچھ نو بتاتے ہیں اور چودہ نام بھی گنوائے جاتے ہیں یعنی اکھراوٹ[1]، پدماوت[2]، سکھراوت[3]، چنپاوت[4]، اتراوت[5]، مٹکاوت[6]، چتراوت[7]، کہرواً نامہ[8]، مورائی نامہ[9]، لکھرانامہ[10]، پوستی نامہ[11]، مہرانامہ[12]، ہولی نامہ[13]، آخری کلام[14]. لیکن ان میں سے صرف تین ملتی ہیں۔ اکھراوٹ، پدماوت اور آخری کلام. باقی کا کہیں پتہ نہیں شک ہوتا ہی کہ تھیں بھی یا نہیں۔ مجھے تو قراین سے ایسا گمان ہوتا ہی کہ دراصل ملک صاحب کی تصانیف چودہ سے کہیں کم تھیں۔ یہ محض ان کے ارادت مندوں کا زور تخیل ہی جس نے تصانیف کی تعداد کو اتنا بڑھا دیا ہی اور اگر ایسا نہیں ہی تو پھر قافیہ پیمائی سے کام لیا گیا ہوگا کیونکہ اُن ناموں کے علاوہ جن سے کان آشنا ہیں جو نام بتائے جاتے ہیں وہ یا تو پدماوت کے قافیے میں ہیں یا "نامہ" کی ترکیب کے ساتھ۔

---

[1] ملک صاحب کی جن چودہ تصانیف کے نام لیے گئے ہیں اس میں سے دو نام اتراوت اور مٹکاوت تو حکیم احمد اشرف صاحب جائسی کے بتائے ہوئے ہیں جو اور کہیں نہیں ملتے بقیہ بارہ ناموں میں سے آٹھ رسالہ عبدالقادر جائسی و سیّد علی نقی صاحب جائسی کی تاریخ دونوں میں مشترک ہیں باقی رسالوں میں سے "چتراوت" اور "کہرانامہ" کے نام صرف عبدالقادر صاحب نے دیے ہیں اور سکھراوت کا تذکرہ محض علی نقی صاحب نے کیا ہی اور ایک نام خزینۃ الاصفیا سے معلوم ہوتا ہی یعنی "ہولی نامہ"

تمام تصانیف بھاکا زبان میں بتائی جاتی ہیں اور جتنی اب تک دستیاب ہو سکی ہیں ان کا موضوع تصوّف ہے یا مذہبی عقیدت مندی اور جو اصل نسخے ابتداءً ملے وہ سب فارسی رسم الخط میں ہیں۔ البتہ اکھراوٹ کی چوپائیوں کو بلا لحاظ "حروف تہجی" "ہندی لگرا" سے شروع کرنا اس گمان کو قوت پہنچاتا ہے کہ ملک صاحب نے اکھراوٹ کو ہندی رسم الخط میں لکھا ہو گا۔

پدماوت پدماوت ملک صاحب کا شاہ کار ہے قبل اس کے کہ اس نظم کے متعلق تنقیدی حیثیت سے گفتگو کی جائے اور نظم کی زبان، تسلسل اور روانی پر تبصرہ کرتے ہوئے اشعار کی برجستگی ہندی مذاق کی تشبیہوں، استعاروں کے استعمال محاکات کی کثرت اور حسن ادا کی دل نشینی کے متعلق کچھ عرض کیا جائے اصل قصّے کو سُنا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ اسی قصّے پر جو پدمنی اور رتن سین کی محبت اور علاؤالدین کی چتوّر پر فوج کشی کا ایک دلچسپ افسانہ ہے نظم کی عالیشان عمارت بنائی گئی ہے۔

اس کے بعد پدماوت پر مختلف پہلوؤں سے تبصرہ کرنے سے نظم اور نثر، کہانی اور تاریخ، شاعر اور مورّخ کا فرق بھی ظاہر ہو جائے گا۔ تصوّف اور معرفت کی جو جھلک نظم میں پائی جاتی ہے اس پر بھی کافی روشنی پڑے گی۔ اس وقت تو قصّہ سُنیے۔

پدماوت کا قصّہ قدرت نے سنہل دیپ کو انواع واقسام کی نعمتوں اور عطیوں سے مالا مال کیا تھا موسم کی خوشگواری، مناظر کی خوبصورتی اور زمین کی زرخیزی سے

سنہل کا چپہ چپہ دل کش اور دل فریب تھا اور گندھر وسین جیسے مدبّر منتظم منصف مزاج اور نیک دل بادشاہ کی حکومت کی بدولت رعایا خوش حال تھی، ملک میں امن وامان تھا۔ نہ باہر کے حملوں کا خوف، نہ اندرونی شورشوں کا خدشہ!!۔

ظاہر ہے ایسی روشن زمین میں ایسے شاداب مرغزاروں اور ایسے خوش منظر مقامات پر کیا ہو جو بمصداق "ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد" دل فریب نہ ہو جائے۔ لیکن جو شہرت راجا گندھر وسین کی بیٹی شہزادی پدماوتی کو اپنے حسن وجمال کی بنا پر حاصل تھی اُسے راجا کے پایۂ تخت یعنی سنہل کی آراستگی اور دل کشی سے کوئی سروکار نہ تھا بلکہ اس کے ذاتی محاسن پر مبنی تھی جس میں سیرت اور صورت دونوں شامل ہیں۔ لیکن عجیب بات تھی کہ عیش وآرام کی گود میں پل کر جب پدماوتی سیانی ہوئی تو بجائے اس کے کہ شاد وخوش دل نظر آتی متفکر رہنے لگی۔ اور جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا اُس کی دل گرفتگی بڑھتی جاتی تھی۔ شاید پدماوتی کسی کو اپنا شریکِ زندگی بنانا چاہتی تھی (تاکہ شباب کے بہار کی اُس کے ساتھ سیر کرے اور اُس سے دل سیر ہونے کے بعد اُس کے ساتھ بیٹھ کر گزری ہوئی پُر لطف گھڑیوں کی یاد سے دل بہلایا کرے) ایسا شریکِ زندگی اُسے اب تک نہ ملا تھا۔ یا یوں کہیے کہ راجہ گندھر وسین کی نظروں نے کسی کو منتخب نہ کیا تھا۔

ایک روز پدماوتی کو معمول سے زیادہ ملول دیکھ کر ہیرامن توتے نے (جسے پدماوتی بہت عزیز رکھتی تھی) اس کی افسردگی کا سبب دریافت کیا۔ شہزادی سے اُن جذبات کا حال سُن کر جو اُسے انگاروں

کے بستر پر سُلاتے تھے۔ توتے نے پدماوتی کے لایق شوہر تلاش کرنے کی اجازت چاہی۔ سوء اتّفاق سے ان واقعات کی اطّلاع راجا تک پہنچی اور اُس نے توتے کو مارڈالنے کا حکم دے دیا۔ لیکن بعد میں پدماوتی کی منّت سماجت اور محل کی عورتوں کی سفارش سے اس کی جان بخشی کر دی گئی۔

اگرچہ اس مرتبہ ہیرامن کی جان بچ گئی لیکن اس واقعے کے بعد سے اُسے ہر گھڑی جان کا خطرہ لگا رہتا تھا۔ اُس نے کئی مرتبہ پدماوتی سے اجازت بھی مانگی مگر اُس کی التجا قبول نہ ہوئی تو مجبوراً خاموش ہو گیا اور موقع کا انتظار کرنے لگا۔ ایک دن جب پدماوتی اپنی سہیلیوں سمیت غسل کرنے گئی ہوئی تھی ہیرامن نے اپنے کو اکیلا پاکر جنگل کی راہ لی۔ جنگل کے پرندوں نے ہیرامن کا نہایت پُرجوش خیر مقدم کیا۔ اُس کی بڑی مدارات کی اور اس طرح اس کے کئی دن بڑی راحت سے گزرے۔

دس دن بعد ایک بہلیا (چڑی مار) ہری پتّوں کی ٹٹّی لیے اس جنگل میں پہنچا جہاں ہیرامن تھا۔ اور پرند تو اُس چلتے ہوئے پیڑ کو دیکھ کر اُڑ گئے لیکن ہیرامن بے خبری میں وہیں بیٹھا رہا۔ آخر کار بہلیے نے اُسے پکڑ لیا اور بازار میں بیچنے کی غرض سے لے گیا۔ چتّوڑ کے ایک آدمی نے جو کچھ تجارتی فواید کے خیال سے سنہل کے بازار میں آیا تھا اس توتے کو اس کی خصوصیتوں اور خاص کر معلومات کی بنا پر منفعت کا اچھا ذریعہ سمجھا اور اُسے خرید کر چتّوڑ لے گیا۔ وہاں اس توتے کی شہرت چتّوڑ کے راجا رتن سین تک پہنچی اور اُس نے

ایک لاکھ رُپے کے بدلے اُسے خرید لیا۔

ایک دن جبکہ رتن سین شکار کو گیا تھا۔ اُس کی رانی ہیرامن کے پاس آئی اور پوچھنے لگی کہ آیا دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی خوبصورت ہی۔ اُس پر توتے نے پدماوتی کے حسن وجمال کا نہایت شرح وبسط کے ساتھ ذکر کیا اور طنز آمیز لہجے میں کہا کہ اُن میں اور تم میں روز روشن اور شب دیجور کا فرق ہے۔ توتے کی گفتگو سُن کر رانی ناگمتی کا چہرہ فق ہوگیا وہ ڈری کہ اگر یہ توتا رہا تو کسی دن راجا کے سامنے بھی پدماوتی کا یونہی ذکر کرکے اُسے پدماوتی کے عشق میں مبتلا کر دے گا۔ پھر کہیں راجا اُس کے عشق میں جوگی بن کر نکل نہ جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رانی کے دل میں توتے کی جو محبت تھی وہ عداوت سے بدل گئی اور اُس نے ہیرامن کو مار ڈالنے کے لیے ایک خادمہ کے سُپرد کیا۔ خادمہ نے (کچھ خیال کرکے) اُسے مارا نہیں بلکہ چھپا رکھا۔

شکار سے پلٹنے پر جب بادشاہ نے توتے کو نہ پایا تو اُسے اتنا افسوس ہوا کہ اُس نے کھانا پینا تک چھوڑ دیا جب بادشاہ کے رنج میں بجائے کمی کے اضافہ ہی ہوتا گیا تو کسی نہ کسی بہانے سے توتا اُس کے سامنے لایا گیا اور اس نے تمام واقعہ کہہ سُنایا۔

یہ واقعہ سُن کر رتن سین کو پدماوتی کا حال معلوم کرنے کی بڑی خواہش ہوئی۔ جس عورت کے ذکر نے ایک عورت کے ہاتھوں کے توتے اُڑا دیے تھے وہ ذکر ایسا جادو نہ تھا جو رتن سین پر اثر نہ کرتا توتے کے مُنہ سے پدماوتی کی رعنائیوں کا تذکرہ سُن کر رتن سین

بالکل از خود رفتہ ہو گیا اور مجنونوں کی طرح پدماوتی کی تلاش میں گھر سے رُخصت ہُوا۔ ہیرامن بھی راہ بتانے کے لیے ساتھ ہولیا۔

راجہ رتن سین کے ہمراہ سولہ ہزار کنور بھی جوگی بن بیٹھے اور یہ قافلے کا قافلہ ملک کالنگ پہنچا۔ وہاں کے راجا گجپتی سے جہاز لے کر یہ لوگ سنہل[۱] دیپ کی طرف روانہ ہوئے اور سات سمندر پار کر کے سنہل دیپ

---

[۱] سنہل کے متعلق کچھ شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ اگر سنہل نام کو ٹھیک مان لیں تو وہ راجپوتانے یا گجرات کا کوئی مقام ہوگا نہ کہ سنہل دیپ کیونکہ سنہل دیپ میں نہ راجپوتوں اور وہ بھی چوہان راجپوتوں کی بستی کا کوئی پتہ چلتا ہے اور نہ قراین بتاتے ہیں کہ ایسے دُور دراز جزایر میں اہل ہند خصوصاً راجپوت ازدواجی تعلقات (جس کا ذکر آگے آئے گا) قایم کریں گے۔ وہ بھی تین سو برس پہلے جبکہ اہل ہند باہر کے ممالک سے قطع تعلق کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ سنہل اور تامل ایسے مقاموں میں پدماوتی ایسی حسین عورت کا ہونا گورکھ پنتھی سادھوؤں کی من گھڑت معلوم ہوتی ہے۔ ان تمام باتوں کا لحاظ کرتے ہوئے پدمنی کو سنہل دیپ کا بتانا درست نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ گورکھ پنتھوں کی وہ روایتیں جس میں حسین و جمیل عورتوں (پدمنوں) کا سادھوؤں کو بہکانے کا ذکر ہے ملک صاحب کا ماخذ ہوں۔

سنہل کی "پدمنوں" کے دل لبھانے کا یہ قصہ بہت مشہور ہے:۔

گورکھ ناتھ (سمت ۱۴۰۷) کے گرو مچھندر ناتھ جب سنہل میں اپنی خدارسی کا امتحان دینے گئے تو پدمنوں کے جال میں پھنس گئے اور انھوں نے انھیں ایک کنوئیں میں قید کر دیا۔ اپنے گرو کی تلاش میں گورکھ ناتھ بھی سنہل گئے اور اسی کنوئیں کے قریب سے گزرے جہاں ان کے گرو نظر بند تھے۔ وہ اپنے گرو کی آواز پہچان کر ٹھہر گئے اور بولے:۔

"جاگ مچھندر گورکھ آوا"

پہنچے وہاں جہاز سے اُتر کر رتن سین مع اپنے ہمراہیوں کے مندر میں پوجا کرنے لگا اور توتا پدماوتی سے ملنے کی غرض سے شہر کی طرف روانہ ہوا۔ جاتے وقت وہ کہہ گیا کہ پدماوتی بسنت پنچمی کے دن اسی مہادیو کے مندر میں پوجا کرنے آئے گی تو اس کے درشن ہوں گے اور مراد بر آئے گی۔

ہیرامن کو عرصے کے بعد دیکھ کر پدماوتی بہت روئی۔ جب خاموش ہوئی تو توتے نے اپنے نکل بھاگنے، پکڑے جانے اور بکنے کا پورا پورا حال بیان کیا اور اسی سلسلے میں راجا رتن سین کے حسن کی بیحد تعریف و توصیف کی اور یہ بھی کہا کہ "وہ ہر نہج سے تمھارے قابل ہے اور تمھاری محبّت میں جوگی بن کر یہاں تک آپہنچا ہے۔ توتے کے مُنہ سے راجا کا ذکر سُن کر پدماوتی نے عہد کیا کہ سوائے رتن سین کے اور کسی دوسرے کی ہو کر نہ رہے گی۔ ساتھ ہی ساتھ بسنت پنچمی کے روز راجا سے ملنے کا وعدہ بھی کرلیا۔

پدماوتی سے باتیں کرکے توتا رتن سین کے پاس پلٹ آیا اور راجا کے شہزادی کے موہ لینے کی خوش خبری سنائی۔

بسنت پنچمی کے دن پدماوتی سہیلیوں سمیت مندر میں پہنچی اور اُس طرف بھی گئی جدھر رتن سین اور اُس کے ہمراہی فروکش تھے لیکن آنکھیں چار ہوتے ہی رتن سین سربسجود ہو کر غش ہو گیا۔ پدماوتی بے ہوش جوگی کے پاس آئی اور اُسے ہوش میں لانے کے لیے صندل چھڑکا لیکن جب وہ کسی طرح ہوش میں نہ آیا تو چندن سے اُس کے سینے پر یہ لکھ کر چلی گئی۔

"جوگی تو نے بھیک حاصل کرنے کے لایق جوگ نہیں سیکھا۔ جب پھل ملنے کا وقت آیا تب سو گیا"۔ راجا کو جب ہوش آیا تو اُسے بڑی پشیمانی ہوئی اور اُس نے خود کُشی کا ارادہ کیا۔ رتن سین کے اس ارادے سے دیوتا بڑے متوحش ہوئے۔ انھیں خوف تھا کہ راجا کے ارادوں میں کامیابی دنیا کی تباہی کا سبب ہوگی۔ گویا آتش محبت کے اثر سے وہ بخوبی واقف تھے۔

غرض مخلوقِ خدا کی جاں بری کے خیال سے تمام دیوتا مہا دیو جی کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن سے مدد کے خواستگار ہوئے۔ مہا دیو جی کوڑھی کے بھیس میں بیل پر سوار ہو کر مع پاربتی دیوی کے راجا کے پاس آئے اور خود کُشی کا سبب دریافت کیا۔

پدماوتی کے ساتھ راجا کے عشق کا حال معلوم کر کے پاربتی دیوی کو یہ خیال ہوا کہ رتن سین کی محبت کا امتحان لیا جائے۔ اس ارادے سے وہ نہایت حسین و جمیل عورت کے لباس میں راجا کے قریب جا کر کہنے لگیں "مجھے اندر نے بھیجا ہے۔ پدماوتی کو چھوڑ میں حاضر ہوں"۔

رتن سین نے جواب دیا "مجھے پدماوتی کے سوا کسی سے مطلب نہیں" یہ جواب پا کر پاربتی دیوی کو یقین ہو گیا کہ راجا کا عشق سچا ہے۔

دوران گفتگو میں رتن سین کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ کوڑھی کے جسم پر نہ تو مکھیاں بیٹھتی ہیں اور نہ اس کی پلکیں جھپکتی ہیں۔ اس نے طے کیا کہ یہ کوئی پہنچا ہوا بزرگ ہوگا لیکن کچھ دیر کے بعد اس نے مہا دیو جی کو پہچان لیا اور قدموں پر گر پڑا۔ مہا دیو نے اُسے حفظ جاں کا تعویذ دیا اور سنہل گڑھ میں داخل ہونے کا راستہ بتایا۔

القصّہ مہادیوجی سے سنہل کے داخلے کا راستہ معلوم کر کے رتن سین مع ہمراہیوں کے سنہل گڑھ پر چڑھنے لگا۔

پدماوتی کے شوق میں رتن سین نے دنوں کی راہ گھنٹوں میں طے کی اور راتوں رات قلعے کے پھاٹک تک پہنچ گیا لیکن ابھی اس نے دروازے کو کھولا ہی تھا کہ صبح ہو گئی اور شاہی فوج نے اسے حراست میں لے لیا۔ گرفتار ہونے سے قبل جب رتن سین کے ہمراہی راجا کی فوجوں سے مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ ہوئے تو اُس نے اپنے ساتھیوں کو یہ کہہ کر باز رکھا کہ "راہِ عشق میں پند و پیکار بیکار ہی"۔

قیدیوں کا یہ قافلہ جب بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا تو اُس نے سب کے لیے سولی کا حکم دیا۔ اس حکم کی خبر پاکر پدماوتی کے اضطراب میں اور بھی اضافہ ہوا۔ لیکن جب توتے کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ مہادیوجی نے اُنھیں ایک ایسی چیز مرحمت فرمائی ہی جس سے اُن کی جان کو کسی قسم کا ضرر نہیں پہنچ سکتا تو شہزادی کو کچھ سکون ہوا۔

بادشاہ کے حکم کی تعمیل کے لیے تیاریاں شروع ہو گئیں، ایک طرف تو لوگ تیاریوں میں مصروف تھے اور دوسری طرف رتن سین کی زبان پر پدماوتی کا نام تھا اور چہرے پر آثارِ فرقت۔ جب تمام انتظامات مکمل ہو گئے اور تعمیل میں صرف چند لمحوں کی کسر رہ گئی تو مہادیوجی بھاٹ کی شکل میں گندھروسین کے سامنے آئے اور رتن سین کا تعارف اس طرح کیا کہ "یہ شخص جوگی نہیں راجپوت ہی۔ یہ عالی نسب اور عالی منزلت اور ہر لحاظ سے تمھاری لڑکی کے مناسب شوہر ہی"۔

بھانٹ کے مُنہ سے یہ آخری فقرہ سُن کر بادشاہ اور بھی برہم ہوا اور نہایت تُرش لہجے میں سولی کا حکم دیا۔ مہا دیوجی کے ساتھ بادشاہ کا یہ طرزِ عمل رتن سین کے ہمراہیوں کو پسند نہ آیا اور وہ اس قدر برانگیختہ ہوئے کہ باوجود رتن سین کی ممانعت کے لڑائی کے لیے تیار ہو گئے۔ اب کیا تھا فریقین میں جنگ چھڑ گئی اور مہادیوجی مع دوسرے دیوتاؤں کے رتن سین کی کُمک کے لیے آکھڑے ہوئے۔ جنگ کے دَوران میں گندھروسین (سنہل کے راجا) کو مہادیو کے گھنٹوں کی آواز سُن کر خیال ہوا کہ دیوتا اس کے مخالف کے معین معلوم ہوتے ہیں۔ جب یہ خیال یقین کی حد کو پہنچ گیا تو سنہل کے راجا نے صلح کا پیغام بھیجا اور مہادیوجی کو پہچان کر شرمندہ ہوا اور کہا کہ "لڑکی آپ کی ہے جسے چاہے دیجیے۔"

اب تو نقشہ ہی بدل گیا، ہیرامن نے شروع سے آخر تک ساری داستان کہہ سنائی اور اس طرح پدماوتی کی شادی بڑی دھوم دھام سے رتن سین کے ساتھ کر دی گئی۔ رتن سین کے ہمراہی بھی وہیں بیاہ دیے گئے اور کچھ دنوں کے لیے سنہل ان سب کا گھر بن گیا۔

ادھر تو سنہل میں عیش و سرور کی محفلیں گرم تھیں اور ہر گوشہ "دامانِ باغبان و کفِ گُل فروش" بنا ہوا تھا اُدھر چتوڑ میں رتن سین کی فرقت زدہ رانی ناگمتی اپنے شوہر کی مفارقت میں برہا کی کوک سے ایک ہنگامۂ حشر برپا کیے ہوئے تھی۔ اُس کی دل گداز آہوں سے دنیا مغموم تھی اور کیا عجب کہ آسمان تک اُن کا اثر ہوتا ہو۔ ناگمتی کے بلک بلک کر رونے سے جانور تک روتے تھے اس کے رنج و غم کی یہ نوبت پہنچی کہ ایک پرندے سے نہ رہا گیا اور اُس

نے ناگمتی سے رونے کا سبب دریافت کیا۔ سبب معلوم کرکے اُس پرندنے وعدہ کیا کہ وہ سنہل دیپ جاکر چتّور اور ناگمتی کی تباہ حالت کا ذکر رتن سین سے کرے گا اور یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ رتن سین کو واپس لانے کی ہر امکانی کوشش کرے گا۔ ناگمتی سے وعدہ کرکے وہ سنہل کی طرف اُڑا اور کچھ مدّت میں وہاں پہنچ گیا حسن اتفاق سے جنگل کے جس پیڑ پر وہ جاکر بیٹھا تھا اس کے نیچے رتن سین شکار کھیلتا ہُوا آیا اور دم لینے کے لیے ٹھہر گیا۔ پرندنے رتن سین کو پہچان کر چتّور کی تمام حالت جوں کی توں بیان کردی۔ واقعات کو سُن کر اُس کا دل سنہل سے اُچاٹ ہو گیا اور وہاں کا عیش وآرام بے حقیقت نظر آنے لگا۔

بے انتہا مال ودولت ساتھ لے کر رتن سین سنہل سے رخصت ہُوا۔ جہاز ابھی آدھے سمندر میں بھی نہ پہنچے تھے کہ سخت طوفان آیا اور رتن سین کا پورا قافلہ لنکا کی طرف بہ نکلا۔ لنکا پہنچ کر ایک راکشش ملا جو راستہ بتانے کے بہانے سے رتن سین کو ایسے مقام پر لے گیا کہ جہاز چکّر کھانے لگے اور نکلنا مشکل ہوگیا۔ تمام آدمی گھوڑے اور ہاتھی جو ساتھ تھے سب ڈوبنے لگے۔ اس تباہی سے وہ مردم آزار تو مارے خوشی کے پھولا نہ سماتا تھا۔ بارے ایک پرند کی امداد سے اس گرداب بلا سے نجات ملی۔ پھر بھی چونکہ ہچکولوں کی وجہ سے جہاز ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا تھا ایک تختے پر ایک طرف رانی بہ نکلی اور دوسری طرف دوسرے تختے پر راجا، پدماوتی بہتے بہتے وہاں پہنچ گئی جہاں سمندر کی لڑکی لکشمی اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ لکشمی بیہوش پدماوتی

کو لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ جہاں ایک عرصے کے بعد اُسے ہوش آیا تو رتن سین کی جُدائی سے بہت مضطرب ہوتی اور اپنے کو نئے ماحول اور راجپوتوں میں دیکھ کر اور بھی زاید پریشان ہوئی۔ لکشمی نے پدماوتی کے اضطراب کو دیکھ کر اپنے والد سمندر سے رتن سین کے تلاش کرنے کی درخواست کی اور پدماوتی کو راجا کے مل جانے کا یقین دلاکر تسلی بخشی۔

راجا رتن سین بہتے بہتے ایسے مقام پر پہنچا جہاں مونگے کے ٹیلوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اب راجا کے لیے پدماوتی کی جدائی ناقابل برداشت تھی یہاں تک کہ اُس نے جان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھنے کی ٹھان لی۔ وہ اپنے ارادے کو پورا کرنے والا تھا کہ سمندر کا دیوتا اُس کے سامنے آکھڑا ہوا اور کہنے لگا " جان کیوں دیتے ہو؟ میری لاٹھی پکڑ کر آنکھیں بند کر لو میں تمھیں پدماوتی کے پاس پہنچائے دیتا ہوں"۔

جب رتن سین اس جزیرے میں پہنچا جو سمندر کا جائے قیام تھا تو لکشمی کو راجا کے عشق کی امتحان کی سوجھی اور وہ پدماوتی کی صورت میں اس کے راستے میں جا بیٹھی۔ رتن سین اُس کو پدماوتی سمجھ کر اس کی طرف لپکا لیکن جب نزدیک پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ کوئی اور ہی تو مُنہ پھیر لیا۔ غرض لکشمی رتن سین کو اپنے گھر لائی اور کئی دن تک مہمانی کی۔ رتن سین کے قافلے کے باقی لوگ بھی جو طوفان میں بہ گئے تھے لا کھڑے کیے اور جو مر گئے تھے وہ امرت سے دوبارہ زندہ ہو گئے۔

چند دنوں لکشمی کی صحبت میں گزار کر پدماوتی نے رُخصت چاہی

اور اس طرح رتن سین کا قافلہ پھر ہنسی خوشی چتوڑ کی طرف روانہ ہوا۔ چلتے وقت لکشمی نے پانچ بیش قیمت چیزیں (امرت، ہنس، راج برکش، شاردول اور پارس پتھر) بطور ہدیہ کے دیں جنھیں لے کر پدماوتی چتوڑ پہنچ گئی " پھر تو ناگمتی اور پدماوتی دونوں سکھ چین سے بسر کرنے لگیں " ناگمتی" سے ناگ سین اور " پدماوتی" سے کنول سین پیدا ہوا۔ سنگھل سے پلٹ کر رتن سین نے عنان حکومت پھر اپنے ہاتھوں میں لے لی اور رعایا کی صلاح و فلاح میں مشغول ہو گیا اور مدت تک کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔

ایک دن جبکہ شاہی دربار میں سب درباری حاضر تھے۔ رتن سین نے دریافت کیا کہ " دوج کب ہے"۔ تمام پنڈتوں نے ایک زبان ہو کر کہا " کل" لیکن راگھو چتن پنڈت نے اس سے اختلاف کیا اور کہا کہ " کل نہیں بلکہ آج ہو گی " اس پر بات بڑھی تو راگھو نے غصے میں آکر یہاں تک کہہ دیا کہ " اگر دوج آج نہ ہو تو میں پنڈت نہیں"۔ اس دن تو راگھو کی چڑھ بنی لیکن دوسرے دن بھی چاند پہلے ہی روز کا سا نکلا تو معلوم ہو گیا کہ کل کا چاند راگھو کا علمی معجزہ اور دھوکا تھا۔ دھوکے بازی کے جرم میں رتن سین نے راگھو کو جلا وطنی کی سزا دی۔

راگھو جیسے عالم کی جلا وطنی کوئی معمولی بات نہ تھی خاص کر اس وقت جبکہ وہ اپنے علم کے زور پر جو چاہے کر سکتا ہو۔ پدماوتی کو اس خفگی کا بڑا ڈر تھا وہ اُس کی ناراضگی کو ملک کے لیے بُرا سمجھتی تھی۔ راگھو کو خوش کرنے کے لیے پدماوتی نے اُسے محل کے نیچے بلوایا اور اپنا کنگن جھروکے سے پھینکا۔ راگھو کے دل میں کھوٹ تو تھا ہی اُس

نے اِس موقع کو رتن سین کی مضرت رسانی کے لیے بہت غنیمت سمجھا اور کنگن لے کر دلّی کا ارادہ کیا۔ اس خیال سے کہ کنگن دکھا کر پدماوتی کے حُسن کا ذکر بادشاہ دہلی یعنی علاؤالدین سے کرے گا۔

راگھو کو معلوم تھا کہ علاؤالدین حُسن پرست ہے وہ پدماوتی کا ذکر سُن کر چتّور پر ضرور حملہ کرے گا اور اگر ایسا ہوا (جیسا راگھو کو یقین تھا) تو اس طرح راگھو رتن سین سے بدلا بھی لے گا اور دوسرا کنگن بھی ــــ کینے کی بھینٹ میں رتن سین کی تباہی اور بقیہ دن آرام سے بسر کرنے کے لیے کنگن کی جوڑ اور دلّی کا دربار شاہی۔

یہ سب سوچ کر راگھو دلّی پہنچا۔ علاؤالدین نے اس کا نہایت گرمجوشی سے استقبال کیا۔ اپنا مہمان رکھا اور سرجا نامی ایلچی کو خط دے کر رتن سین کے پاس روانہ کیا بادشاہ نے خط میں لکھا تھا کہ "پدماوتی کو فوراً بھیج دو اس کے بدلے میں جس قدر چاہے ملک لے لو" ــــ خط کے پڑھتے ہی راجا رتن سین غصّے سے لال ہو گیا اور اُسی غصّے میں ایلچی کو نکلوا دیا۔

جب اس طرح کام نہ نکلا تو علاؤالدین نے چتّور پر چڑھائی کی لیکن آٹھ برس کے محاصرے کے بعد بھی وہ اپنے مقصد میں ناکام ہی رہا اور قلعہ فتح نہ ہوا۔ اس درمیان میں علاؤالدین کو خبر ملی کہ (ہر دے والوں) یعنی مغلوں نے پھر حملہ کر دیا ہے۔ یہ معلوم کر کے بادشاہ نے رتن سین سے کہلا بھیجا کہ مجھے پدماوتی نہیں چاہیے سمندر کی لڑکی لکشمی کے جو پانچ تحائف پدماوتی کے پاس ہیں وہی مجھے دے دو۔ مَیں واپس چلا جاؤں گا۔

راجا کے دو معتبر سرداروں یعنی گورا اور بادل نے آنکھ بند کر کے شاہی فوج پر بھروسا کرنے سے رتن سین کو ہر چند روکا لیکن راجا نے ایک نہ سُنی غرض بغیر مشورہ صلح کر لی اور اُسے قلعہ کے اندر لے گیا۔ راجا کا بادشاہ کو قلعہ کے اندر لے جانا ان کو اور بھی ناگوار ہوا اور وہ خفا ہو کر اپنے گھر چلے گئے۔ قلعے میں بادشاہ کی دعوت بڑے تزک و احتشام سے کی گئی اور اسی سلسلے میں کئی روز تک خوب جشن رہے۔

علاؤالدین ایک دن ٹہلتے ٹہلتے پدماوتی کے محلوں کی طرف جا نکلا تو وہاں بہت سی پری جمال عورتیں اُسے نظر آئیں بادشاہ نے راگھو سے جو اُس کے ہمراہ تھا پوچھا کہ "ان میں پدماوتی کون ہے" راگھو نے کہا کہ "پدمنی یہاں کہاں یہ سب تو اُس کی کنیزیں ہیں" یہ سُن کر علاؤالدین کو پدماوتی کے دیکھنے کا اشتیاق اور بھی زیادہ ہو گیا۔ اور محض پدماوتی کے جلوے کی امید پر محل کے سامنے ہی بیٹھ کر شطرنج کھیلنے لگا۔ حسن اتفاق سے قریب رکھے ہوئے آئینے میں پدماوتی کا عکس پڑا۔ بادشاہ کی آرزو پوری ہوئی۔

غرض کئی روز مہمان رہ کر علاؤالدین نے چتوڑ سے رخصت ہونے کا ارادہ کیا اور رتن سین اُس کے ہمراہ قلعے کے باہر تک پہنچانے کی غرض سے آیا۔ یہاں بادشاہ نے راگھو کے اشارے سے رتن سین کو قید کر لیا اور دلی لے جا کر ایک تنگ کوٹھری میں بند کیا جہاں اس پر طرح طرح کے ظلم ہونے لگے۔

رتن سین کے مخالف کھمبل میر کے راجا دیوپال کو جب راجا کے قید ہو کر دلّی جانے کا حال معلوم ہوا تو اُس نے راجا کی غیر موجودگی سے

ناجائز فایدہ اُٹھانا چاہا اور کومودنی نامی ایک عورت کو قاصد بنا کر بھیجا۔ پہلے تو پدماوتی اس سے یہ سمجھ کر کہ وہ اس کے میکے کی عورت ہے بہت خلوص سے ملی اور اپنا دردِ دل بھی سنایا لیکن بعد میں راز فاش ہوگیا اور کومودنی بڑی بے عزّتی کے ساتھ نکالی گئی۔ اسی طرح دلّی پہنچ کر علاؤالدین نے بھی جاسوسوں کے ذریعے سے پدماوتی کو زن سین سے ملانے کے بہانے بلوانا چاہا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ چتوڑ میں سب کو معذور پاکر پدماوتی گورا[1] اور بادل کے گھر گئی۔ اُن سے راجا کے چھڑانے کی درخواست کی اور علاؤالدین کا مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ کیا۔ ان دونوں نامور سرداروں نے کپٹ کے بدلے کپٹ ہی کرنے کی سوچی۔ کیونکہ بغیر چالاکی کے علاؤالدین سے پیش پانا مشکل تھا۔ کامیابی کی تدبیر سوجھی کہ سولہ سو بند پالکیوں میں سولہ سو سورما راجپوت سرداروں کو اور سب سے زیادہ مرصع اور قیمتی پالکی کے اندر اوزار کے ساتھ ایک لوہار کو بٹھلایا اور مشہور کر دیا کہ پدماوتی سولہ سو کنیزوں کے ساتھ دلّی جا رہی ہے۔ غرض یہ پالکیاں مع چھ چھ کہاروں کے جو دراصل کہاروں کے بھیس میں راجپوت سپاہی تھے دلّی پہنچیں۔ پہرے والے سنتریوں نے رشوت پاکر اُن کا جایزہ بھی نہ لیا اور اس طرح بغیر روک ٹوک تمام پالکیاں قلعے کے اندر داخل ہوگئیں۔

---

[1] گورا کے لڑکے بادل کی عمر کم تھی اور جس دن دلّی جانا تھا اسی دن اس کا گونا آیا تھا۔ لیکن بہادر سپاہی کے دل میں جنگ کی جو اُمنگ اور ملک کی عزت بچانے کا جو ولولہ تھا اُسے کوئی چیز روک نہ سکتی تھی اس نے لڑنے اور مرنے کا ارادہ کر لیا۔ ملک کی حفاظت اور اپنے راجا کی عزت کے ساتھ اس کا ذاتی عیش بے حقیقت تھا عزت کا حق ہے کہ عیش اُس پر قربان کر دیا جائے۔

قلعے میں پہنچ کر بادشاہ کے پاس یہ پیغام پہنچا کہ پدماوتی تو آگئی ہے لیکن وہ راجا سے مل کر خزانے کی کنجیاں اس کے حوالے کرنے کے بعد محل میں جانا چاہتی ہے چنانچہ سجی ہوئی پالکی رتن سین کے محبس تک پہنچا دی گئی پالکی سے نکل کر لوہار نے راجا کی بیڑیاں علیحدہ کر دیں اور وہ اُس گھوڑے پر سوار ہو گیا جو پہلے سے تیار کھڑا تھا۔ راجا کے رہا ہوتے ہی تمام ہتھیار بند سپاہی بھی پالکیوں سے کُود پڑے اور یوں گورا اور بادل رتن سین کو چھوڑا کر چتّور رے گئے۔ بادشاہ کو اس واقعے کی خبر ہوئی تو راجپوتوں کا تعاقب کیا۔ راجپوتوں نے جب شاہی فوجوں کو پیچھے سے آتے دیکھا تو ایک ہزار سپاہیوں کو لے کر گورا ان کا مقابلہ کرنے کو رہ گیا اور بادل راجا کو لے کر چتّور کی طرف بڑھا۔ بہادر گورا بڑی دلیری سے لڑتا رہا لیکن آخر کار سرجا کے ہاتھوں مارا گیا اور راجا رتن سین چتور پہنچ گیا۔

چتّور پہنچ کر رات کو اُس نے پدماوتی کے مُنہ سے دیوپال کے کمینہ پن کا حال سنا اور اسی وقت اس کو باندھ لینے کا عہد کیا۔ صبح ہوتے ہی رتن سین نے کھمبل میر پر حملہ کر دیا۔ رتن سین اور دیوپال کے درمیان سخت معرکہ ہُوا۔ آخر کار رتن سین نے دیوپال کا سر کاٹ کر اس کے ہاتھ پانو باندھے۔ گویا اپنے عہد کو پورا کیا۔ لیکن خود بھی دیوپال کے زخم سے جانبر نہ ہو سکا اور چتّور کی حفاظت کا بار بادل پر ڈال کر راہی ملک عدم ہُوا۔ راجا کی لاش کے ساتھ پدماوتی اور ناگمتی دونوں رانیاں ستی ہو گئیں۔

اتنے میں شاہی فوج چتّور گڑھ آ پہنچی۔ بادشاہ نے پدماوتی کے

ستی ہونے کا حال سُنا۔ بادل نے جیتے جی قلعے کی حفاظت کی لیکن جب وہ "پھاٹک" کی لڑائی میں مارا گیا تب چتّور اسلامی فوجوں کے ہاتھ لگا۔

کہانی کا تاریخی رُخ ملک صاحب کی لکھی ہوئی یہ کہانی دو نمایاں حصّوں میں تقسیم کی جاسکتی ہی۔ ایک تو رتن سین کے سنہل دیپ جانے اور وہاں سے چتّور پلٹنے تک کی سرگزشت، جسے کسی عنوان سے بھی تاریخی واقعہ نہیں تو داستان محبّت کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ وہی کہانی ہی جو اودھ[1] میں مشہور ہی۔ یعنی رانی اور توتے کی کہانی،

[1] شمالی ہند خاص کر اودھ میں رانی اور توتے کی کہانی اب تک مشہور ہی اور اسی طرح بیان کی جاتی ہی جس طرح ملک صاحب نے اُسے نظم کیا ہی۔ فرق صرف ناموں کے استعمال کا ہی۔

یہ کہانی بیچ بیچ میں گا گا کر کہی جاتی ہی۔ مثلاً راجا کی پہلی رانی آئینے میں اپنا مُنہ دیکھتی ہی۔ تو توتے سے پوچھتی ہی۔

دیس دیس توی پھرے ہو سوئٹا   مورے روپ اور کہوں کوئے

देस देस तो फिरेहौ सुग्टटा
मोरे रूप और कहुं कोइ

ترجمہ } ای توتے تو تو ملک ملک گھوما ہی میری صورت کا کہیں دوسرا بھی ہی۔

توتا جواب دیتا ہی:-

کا بکھانو سنہل کی رانی   ترے روپ بھرین سب پانی

का बखानु सिन्हल की रानी
तोरे रूप भरैं सब पानी

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۱ پر ملاحظہ کیجیے

ملک محمد نے ناموں کے تعین سے اُسے ایک نئی چیز ضرور بنا دیا ہے لیکن محض ناموں کا اضافہ کر دینے سے کہانی کو امر واقعہ کی حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ خاص کر ایسی صورت میں جبکہ سنگلدیپ میں چوہان خاندان کے کسی راجا کا سرے سے وجود ہی نہ ہو اور خوبصورت عورتوں کی پیداوار کے لیے اس سرزمین کا سازگار ہونا بھی مشکوک ہو۔ پھر ایسے دُور دراز مقام کے سفر کا قصد کرنا عہدِ علائی میں ایسا آسان بھی نہ تھا جیسا کہ شیر شاہ یعنی خود ملک صاحب کے زمانے میں ہو گیا تھا اور وہ بھی محض توتے کے بیان پر —— یہ سچ ہے کہ ہندی شاعری میں توتے کا درجہ بہت بلند ہے اور اُس کی گفتگو میں اکثر سمجھ اور ارادہ پایا گیا ہے۔ تاریخوں[1] میں بھی اکثر واقعے توتے کی زیرکی کے درج ہیں۔ لیکن یہ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۰

ترجمہ} سنہل کی رانی کا کیا ذکر کروں وہاں تمہاری جیسی تو پانی بھرتی ہیں۔

اس قسم کی اور بھی کہانیاں اودھ میں رائج ہیں جو گا گا کر کہی جاتی ہیں مثلاً بالا لکھن دیو کی کہانی۔

[1] مرآۃ سکندری، تاریخ گجرات میں ایک واقعہ شہنشاہ ہمایوں کے زمانے کا درج ہے۔ جب ہمایوں نے گجرات کے فرمانروا بہادر شاہ پر فوج کشی کی تو اُس نے اپنی تمام تر قوت قلعۂ جاپانیر کے حاصل کرنے میں صرف کر دی پھر بھی فتح کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ قلعۂ جاپانیر بہادر شاہ کا مستقر اور اس کی قلمرو کا سب سے زبردست قلعہ تھا۔ سلطان بہادر کا اسلحہ خانہ اور مال و دولت سب اسی قلعے میں تھی۔ دوران جنگ میں بہادر شاہ کا معتمد سپہ سالار رومی خاں اور میر آتش یعنی

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۲ پر ملاحظہ کیجیے

کوئی قطعی دلیل اس کی نہیں ہو سکتی کہ ملک صاحب کی کہانی کے اس حصّے کی بنیاد کسی واقعے پر رکھی گئی ہے۔ کہانی کے اس حصّے میں

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۱

ناظم توپ خانہ ہمایوں سے مل گئے اور اپنی سازش سے قلعے پر ہمایوں کا قبضہ کرادیا۔ فتح کے بعد جب وہاں کا مال غنیمت ہمایوں کے دربار میں پیش کیا گیا تو اُس میں ایک زبان داں توتا بھی تھا جو آدمی کی طرح باتیں کرتا تھا اور سمجھ کر بات کا جواب دیتا تھا۔ جس وقت ہمایوں کے سامنے پیش ہوا اور اس کی صفت بیان ہونے لگی تو اُسی وقت چوب دار نے عرض کیا "رومی خاں حاضر ہے" اسے باریابی کی اجازت دی گئی جیسے ہی وہ تخت شاہی کے سامنے آکر آداب بجالایا۔ توتے نے اُس کی صورت دیکھتے ہی کہا "ہٹ پاپی رومی خاں نمک حرام" توتے کے اس کلمے سے رومی خاں کی آنکھیں ندامت سے جھک گئیں سارا دربار متحیر ہو گیا۔ ہمایوں نے کہا "رومی خاں چہ کنم جانور است ورنہ زبانش بریدم" (رومی خاں کیا کروں یہ جانور ہے ورنہ اس کی زبان کاٹ لیتا) اسی طرح انگریزوں میں بھی توتے کے باتیں کرنے کے واقعات مشہور ہیں۔ مثلاً رابنسن کروسو (ROBINSON CRUSOUE) کے افسانے (جو بعضوں کے نزدیک تاریخی واقعات ہیں) اُن میں ایک ایسے توتے کی باتوں کا ذکر ہے جس سے غربت و بیکسی میں اُسے مدد ملی تھی۔ توتے کی ذہانت کے ان تاریخی یا بظاہر تاریخی واقعات کے علاوہ اور قصّے بھی مشہور ہیں۔ مثلاً فسانۂ عجایب کا آغاز بھی توتے سے ہوتا ہے۔ جان عالم نے ایک توتا مول لیا۔ گھر میں لایا اس کی ملکہ نے اپنے حُسن پر ناز کیا۔ توتے نے اُس کے حُسن کی مذمّت کی اور ایک دوسری مہ جبین انجم آرا کے حسن کی تعریف کرکے جان عالم کو اس کے عشق میں مبتلا کر دیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

مختلف ماہیت اور اقسام کے خیالی سمندروں، رتن سین کے امتحان عشق، راکششوں کی مردم آزاری، تمدّن اور معاشرت اور اسی قسم کے متعدد کچھ ایسے تذکرے آگئے ہیں جن سے نتیجہ صریح نکلتا ہی کہ یہ حصّہ یا تو ہندوؤں کے مذہبی افسانوں سے اخذ کیا گیا ہی یا خود ملک صاحب کے زمانے کی ذاتوں، پیشوں، لباس، رسم و رواج، معاشرت، میلے، ٹھیلے، بیاہ، برات وغیرہ کے چشم دید واقعات پر مبنی ہی اور یا شاعر جائسی کے زورِ تخیل کا نتیجہ ہی جو بھی ہو یہ حصّہ کسی طرح بھی نہ تو عہد علاؤالدین سے متعلق کہا جا سکتا ہی اور نہ کلّیتاً شیر شاہ کے زمانے سے۔ دوسرے حصّے میں راگھو کے نکالے جانے سے لے کر پدماوتی کے ستی ہونے بلکہ یوں کہیے کہ چتّور فتح ہونے تک کے حالات شامل ہیں۔ اس حصّے کو مختلف تذکروں، تاریخوں اور قصّوں میں بیان کیا گیا ہی اور متعدد[1] لوگوں نے اُسے مختلف زبانوں یعنی فارسی، اُردو، ہندی، مرہٹی،

---

[1] ۱۔ حسین غزنوی نے بعہد فرخ سیر اسے فارسی میں نظم کیا اور "قصص پدماوت" نام رکھا جس کا ایک نسخہ دہلی کے کتب خانۂ عام (ہارڈنگ لائبریری) میں محفوظ ہی۔

۲۔ رائے گوبند منشی نے اس کہانی کو فارسی میں لکھ کر تحفۃ القلوب کے نام سے موسوم کیا۔

۳۔ اُن کے بعد ضیاءالدین عبرت اور غلام علی عشرت نے مل کر ۱۷۸۶ء میں اس کہانی کو اردو نظم میں منتقل کیا۔

۴۔ ۱۸۷۳ء میں محمد قاسم علی صاحب بریلوی نے ملک صاحب کے پدماوت کا ترجمہ اردو نظم میں کیا۔ اور ۱۸۹۶ء میں مرزا عنایت علی بیگ عنایت لکھنوی نے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۴ پر ملاحظہ کیجیے۔

بنگالی اور گجراتی وغیرہ میں منتقل کرکے ایسی شہرت دے دی ہے کہ اب اُسے ایک تاریخی امرواقعہ کی سی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ یہاں تک کہ کرنل ٹاڈ مؤلف "تاریخ راجستھان" نے اس قصّے کو اکبر اعظم کے عہد میں "کھمان راسا" یعنی چتّور کے قومی شاہ نامے اور کاغذات سے اخذ کرکے انگریزی میں نقل کیا اور ابوالفضل نے آئین اکبری میں اس افسانے کو جگہ دی پھر عہد جہانگیری میں غلام حسین نے تاریخ فرشتہ میں قدرے تغیّر کے ساتھ اُسی افسانے کو لکھا۔

عہد علائی اور اُس کے عین مابعد کے موّرخین میں امیر خسرو دہلوی، نظام الدین اور مولانا عصامی اور ضیاء الدین برنی نے چتّور کے حملے کا ذکر کیا ہے مسلمان تذکرہ نویسوں میں امیر خسرو نے جو چتّور کے حملے میں بادشاہ کے ساتھ تھے مقابلتاً تفصیلی ذکر کیا ہے۔ آئین اکبری میں بھی مفصل تذکرہ فتح چتّور کا ملتا ہے۔ برنی اور فرشتہ دونوں نے تفصیل نہیں دی اور نظام الدین نے تو چند سطروں ہی پر اکتفا کی ہے۔

نفس معاملہ کے متعلق امیر خسرو کا بیان صرف اس قدر ہے کہ قلعۂ چتّور دوشنبہ کے دن ۱۱ محرم الحرام ۷۰۳ھ مطابق ۱۳۰۳ء کو فتح ہوا۔ رائے بھاگا لیکن بعد میں اُس نے اپنے کو بادشاہ کے حوالے کر دیا تین ہزار

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۳

پدماوت کو اُردو نثر میں منتقل کیا۔

منظوم ترجمہ مطبع نولکشور میں اور نثر والا ترجمہ مطبع اعظمی کانپور میں طبع ہوا

۵۔ مولوی محمد حسین آزاد نے قصص ہند میں اسے نقل کیا۔

ہندوؤں کے قتل کا حکم دینے کے بعد علاؤالدین نے چتّوڑ کی سلطنت اپنے بیٹے خضر خاں کے حوالے کی چتوڑ کا نام خضر آباد رکھا۔ خلعت، ایک سُرخ شامیانہ اور رایت سبز و سُرخ خضر خاں کو دے اور اُس پر لعل و یاقوت نچھاور کیے۔ پھر دلّی پلٹا"

مسلمان تذکرہ نویسوں کے یہاں تفصیل نہ ہونے کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے۔ یعنی یہ کہ اُن کے بیانات خاص خاص باتوں میں راجپوتوں کی روایات کی رد کرتے ہیں اور پدمنی کے افسانے یعنی اُس کے عشق میں علاؤالدین کے چتّوڑ فتح کرنے اور اُسے نہ پانے کا تو سوا آئینِ اکبری کے کہیں ذکر بھی نہیں ہے۔

اگر اس حملے کا اصل سبب پدمنی کا حُسن ہوتا تو قرینِ قیاس نہیں کہ امیر خسرو کا سا شاعر اور اہلِ دل خزاین الفتوح میں چتّوڑ کے حملے کا ذکر کرنے کے باوجود اِس واقعے کو یوں نظر انداز کر دیتا جیسے ہوا ہی نہیں اور علاؤالدین کے فتح چتّوڑ اور دیگر فتوحات کے بارے میں اس تصنیف میں صفحے کے صفحے رنگ ڈالتا یا نظام الدین اپنی طبقاتِ اکبری میں چتوڑ کی فتح کے لیے چند سطریں کافی سمجھتے۔ یا شاہ نامۂ مولانا عصامی دہلوی موسوم بہ فتوح السلاطین مصنفہ ۷۵۱ھ / ۱۳۵۰ء میں اس

لے یہ شاہ نامہ مسلم فاتحین ہند کی ایک نایاب تاریخ ہے جو سلطان علاؤالدین حسن گنگو بانیٔ خاندان بہمنی کی سرپرستی میں اس کی فرمایش پر ۷۵۱ھ / ۱۳۵۰ء میں فارسی زبان میں نظم ہوا تھا۔ ڈاکٹر آغا مہدی حسن ایم۔اے آگرہ کالج کی نگرانی میں مرتب ہو کر حال ہی میں آگرہ سے شایع ہوا ہے۔ اصل شاہ نامے کی ایک نقل کتب خانۂ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔

واقعے کا جیسا کہ مشہور ہی ذکر نہ ہوتا۔ حالانکہ خلجیوں کے عہد کو مولانا نے بچپنے میں خود بھی دیکھا تھا اور اس شاہ نامے میں علاؤ الدین کی فتح چتّور کا ذکر بھی موجود ہی۔ عہد علائی اور نیز اس کے علین مابعد کے مؤرخین میں سے ایک کا بھی چتّور کی فتح کے سلسلے میں اشارتاً پدمنی کے وجود کو علاؤالدین کی چڑھائی سبب قرار نہ دینا پتہ دیتا ہی کہ اُن کے نزدیک اس حملے کو کوئی معاشقانہ اہمیت حاصل نہ تھی۔ قراین کے علاوہ واقعات بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہی کہ چتّور پر علاؤالدین کا حملہ اُسی جذبۂ حصولِ نام و نمود کا مرہون منّت تھا۔ جس کی بنا پر وہ سکندر ثانی بننا چاہتا تھا نہ کہ چتّور میں پدمنی کے وجود کا۔

ضیاء الدین برنی مؤلف تاریخ فیروز شاہی نے اس حملے کا سبب شرح و بسط کے ساتھ درج کیا ہی۔ مؤلف تاریخ فرشتہ نے انھیں سے نقل کر کے اپنی کتاب میں اسے درج کیا ہی۔ ضیاء الدین برنی عہد علائی کے ہم عصر مؤرخ اور اس واقعے کے ناقل اوّل یعنی علاء الملک کوتوال دہلی کے حقیقی بھتیجے تھے۔ اس لیے واقعات اور اشخاص متعلقہ کے متعلّق ان کا علم عینی ہی۔ علاوہ فرشتہ کے انگریز محقّقین نے بھی ان کے معلومات سے خوشہ چینی کی ہی۔ فرشتہ کے منقولہ بیان کا آزاد ترجمہ یہ ہی "جب تخت نشینی کے تین ہی سال کے اندر علاؤالدین کی تمام آرزوئیں پوری ہو گئیں۔ گجرات جیسا ملک فتح ہو گیا۔ اور حدود مملکت میں کوئی اُس کا معارض نہ رہا تو اُس کے دل و دماغ میں عجیب و غریب خیالات چکر لگانے لگے۔ اکثر ارکان دولت سے" وقت مِ" کہا کرتا کہ "جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم

نے چار یار کی موافقت سے ایک شریعت یادگار چھوڑی۔ میں بھی اپنے چار یار۔ اُلغ خاں، الپ خاں، ظفر خاں اور نصرت خاں کی امداد سے ایک نئے مذہب و شریعت کی بنیاد ڈال سکتا ہوں اور اگر دہلی کو کسی خیر خواہ کے سپرد کرکے اِن سواروں، ہاتھیوں اور پیادوں کو جو بکثرت جمع ہو گئے ہیں ساتھ لے کر سکندر اعظم کی طرح عزم جہانگیری کروں تو خراسان و ترکستان و ماوراء النہر فتح کرکے فارس، عراق، شام، روم اور حبش وغیرہ کو تسخیر کر لوں۔"

جب دو لاکھ خونخوار مغلوں کے لشکر پر علاؤ الدین کو فتح حاصل ہوئی تو غرور و تکبّر کی اور بھی حد نہ رہی پھر کیا تھا خطبے میں "سکندر ثانی" پڑھا جانے لگا اور سکّون اور فرمانوں کو اس لقب سے زینت دی جانے لگی۔ اہل بزم دل میں تو اِن مہملات پر ہنستے البتہ رُعب شاہی سے کچھ نہ کہہ سکتے۔ بزرگان دین مثل حضرت نظام الدین اولیا قدس سرہٗ اِن ہفوات کو سُن کر رنجیدہ ہوتے اور سلطان کے راہ راست پر آنے کی دعا فرماتے۔

ایک روز علاء الملک کو توال دہلی سے بادشاہ نے اپنے ارادوں کا ذکر کیا اور اُن کے متعلق اس کی رائے دریافت کی۔

علاء الملک کسی قدر ذی علم اور سچّا دین دار تھا دل میں سوچا کہ عمر ختم ہونے کو آئی۔ چند دنوں کے لیے بادشاہ کی خوشامد میں آخرت خراب کرنا ٹھیک نہیں۔ بادشاہ کے چشم و ابرو دیکھنے کے بجائے سچ کہہ دینا زیادہ مناسب ہوگا۔ کلمۂ حق کہنے پر اگر قتل بھی کر دیا گیا تو کچھ مضائقہ نہیں۔ زندگی کی تلخی سے شہادت کی شیرینی بہتر ہے۔

چنانچہ اُس نے عرض کیا کہ "اگر حضور شراب اُٹھوا دیں اور تخلیہ ہو جائے تو جو کچھ مجھ کم عقل کا خیال ہے عرض کروں۔"

جب شراب اور اغیار سے محفل خالی کر دی گئی اور علاوہ علاؤالدین اور اُس کے چار یار کے اور کوئی وہاں نہ رہ گیا تو علاء الملک نے کہا

"دین و شریعت کا تعلق وحیِ آسمانی سے ہے جو انبیا علیہم السلام پر نازل ہوا کرتی تھی اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اُس کا دروازہ بند ہو گیا۔ حضور پر بخوبی روشن ہے کہ حضور پر کوئی وحی نازل نہیں ہوئی۔ پس جو کوئی حضور کے اس دعوے کو سُنے گا آپ سے نفرت کرے گا۔

دین و ایمان ایک عزیز شے ہے۔ اُس کی حفاظت کے لیے ہر مذہب و ملّت کے لوگ بے خطرہ ہو کر بغاوت کریں گے۔ اور عظیم فتنے رُونما ہوں گے جن کا تدارک مشکل ہو گا۔ اور لوگ ہم لوگوں کو بھی بانیٔ فساد سمجھ کر ہماری جان کے دشمن ہو جائیں گے۔ لہٰذا حضور کے دولت و اقبال کے لیے یہی مناسب ہے کہ آیندہ ایسے لوگوں کو ہرگز دل میں جگہ نہ دیں اور نہ اُس کا تذکرہ فرمائیں۔ حضور کو علم ہے کہ چنگیز خاں اور اُس کی اولاد نے ہر طرح کے ظلم و تشدّد سے دینِ محمدی کو مٹانے کی مدّتوں کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ آخر کار دینِ اسلام کی خوبی اور اُستواری دیکھ کر اُس کے بیٹے پوتوں نے اسلام قبول کیا اور کفّارِ یورپ سے جہادِ عظیم کیا، رہا حضور کا دوسرا خیال وہ بنفسہٖ بہت دُرست اور حضور کی ہمتِ شاہانہ کی دلیل ہے۔

لیکن اگر حضور ممالک ایران وغیرہ گئے اور عرصے تک نہ پلٹے تو یہاں کون اس لایق ہی کہ نیابت کا کام انجام دے سکے۔ اس زمانے کو سکندر کے عہد پر قیاس نہیں کر سکتے۔ اُس وقت غدر اور بدامنی شاذ تھے اور پھر سکندر کا وزیر ارسطو جیسا حکیم اور فلسفی تھا۔

اگر حضور کے پاس ایسے بھروسے کے لوگ ہوں تو یہ رائے عین ثواب ہی۔"

بادشاہ نے غور و تامل کے بعد پوچھا کہ "اچھا اگر ہم اس ارادے سے باز آؤں تو یہ لشکر کثیر اور خزانے کس کام آئیں گے اس گوشۂ دہلی پر تو قناعت نہیں ہو سکتی۔"

علاء الملک نے عرض کیا کہ "حضور کے حدود و اقلیم سے قریب ہی مہمات خطیر موجود ہیں مثلاً رن تنبھور، چتّور، چندیر، دھارنگری اور پورا مالوہ۔ اِن کے علاوہ بہت سے دوسرے علاقے ہیں جو اسلام کے مغرور متمرد دشمنوں کے قبضے میں ہیں جن سے سلطنت اسلامی کو اندیشہ ہی پہلے ان کو فتح کر لینا چاہیے بعد کو دنیا کی فتح کا خیال ہونا چاہیے۔"

بادشاہ نے اس گفتگو کے بعد ہی اُسی مجلس میں اُلغ خاں سپہ سالار اعظم کو حکم دیا کہ رن تنبھور پر حملے کی تیاری کرے۔

چنانچہ سنہ ۷۰۱ھ میں محاربۂ رن تنبھور کی تھکی ہوئی فوج نے دم لیا اور سنہ ۷۰۲ھ میں علاؤ الدین نے علاء الملک کوتوال کی ہدایت کے مطابق چتّور پر حملہ کیا جو اُس کے پروگرام میں دوسرے نمبر پر تھا۔

عہد علائی کے مورخین کے سکوت، برنی کی نقل کی ہوئی اِس تاریخی گفتگو

اور ملک محمد جائسی سے قبل کسی تذکرہ نویس کے پدمنی کے عشق میں علاؤالدین کی چتّور پر فوج کشی کرنے کا ذکر نہ ہونے کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ سب سے پہلے جس نے اِس معروضہ واقعے کا ذکر کیا ہے وہ ملک محمد جائسی ہیں اور علاؤالدین اور پدمنی کے معاشقے کی داستان دراصل اِن کے تخیّل کا نتیجہ ہے۔ البتہ بعد میں مورخین واقعہ نگاروں اور افسانہ نویسوں غرض سبھی نے ملک صاحب کی بیان کی ہوئی کہانی سے خوب خوب خوشہ چینی کی ـــــ اور اکبر اعظم کی چتّور پر فوج کشی کے سلسلے میں جب پدماوت راجپوت رجواڑوں کے کبیشروں (بھاٹوں) کے ہاتھ لگی تو اُنھوں نے واقعات کی بنا پر نہیں بلکہ خوشامد اور تملق کی آڑ میں ملک صاحب کی زبان سے سُنی ہوئی کہانی پر خوب خوب حاشیے چڑھائے اور اسے مبالغہ آمیز طریقے پر بطور واقعہ بیان کرنا شروع کر دیا، چونکہ یہ کہانی اُسی زبان میں تھی جسے وہ بولتے اور سمجھتے تھے اس لیے وطنیت اور قومیت کے جذبات بھڑکانے میں بھی اس قصّے سے خاصی مدد لی جانے لگی۔

ابوالفضل جیسے راجپوتوں کے دلدادہ کو جب یہ ماخذ ملا تو کہانی کی جاذبیت پر نقل کرتے ہوئے دریا بہا دیے۔ اس طرح کہانی تاریخ ہوگئی۔ یعنی پدماوتی پر علاؤالدین کے فریفتہ ہو کر اس کے حاصل کرنے کے لیے چتّور پر حملہ کرنے کی فرضی داستان کو ایسی تاریخی اہمیت اور خصوصیت حاصل ہوگئی کہ عرصے تک کسی کو اس کی رد اور تغلیط کی طرف توجہ[1] ہی نہ ہو سکی۔

---

[1] اس افسانے پر بھی حال ہی میں محمد احتشام الدین دہلوی ایم اے (علیگ)
بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۱ پر ملاحظہ کیجیے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ملک صاحب نے پدماوت شیر شاہ سوری کے زمانے میں لکھی تھی۔ پھر اُنھوں نے کیوں ایک فرضی قصّے کو تاریخی اہمیت دے دی اور اگر علاء الدین نے چتّوڑ پر پدمنی کے حاصل کرنے کے لیے حملہ نہیں کیا تھا تو وہ علاء الدین کی طرف ایک بے بنیاد واقعے کو منسوب کر کے ایک جلیل القدر اسلامی بادشاہ کو عوام کی نظروں میں سبک کرنے کا سبب کیوں بنے ؟

ملک صاحب تاریخ نہیں لکھ رہے تھے، وہ تو ایک تمثیلی مثنوی کی طرح ڈال رہے تھے اور اس اعتبار سے اُن تمام واقعات سے اپنے شاعرانہ تخیّلات کو زینت دینے کا خیال اُن کے آگے آگے تھا جن سے مثنوی میں روح اور مضمون میں دلچسپی پیدا ہو۔ خصوصاً جبکہ ایسے واقعات عہد علاء الدین میں نہ سہی شیر شاہ کے زمانے میں جبکہ پدماوت لکھی گئی ہو، پیش بھی آچکے ہوں مثلاً

(۱) گو علاء الدین کے زمانے میں رتن سین[۱] نام کا کوئی راجہ چتّوڑ میں نہ تھا۔ البتہ شیر شاہ کے عہد میں رانا سانگا کا جو بیٹا چتّوڑ کا حکمران تھا اس کا نام رتن سین تھا۔ یہ جلیل القدر بھی تھا اور رفیع المنزلت بھی۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۰

نے اپنی تصنیف "افسانۂ پدمنی" مطبوعۂ محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں جو تبصرہ کیا ہے وہ البتہ کافی مفصّل ہے۔

[۱] اُس وقت کے والیِ چتّوڑ کا نام سنورسی تھا جسے چتوری سمرسی، سمرسین اور سمرسنگھ کہتے ہیں۔

(از فتوح السلاطین مصنفۂ عصابی دہلوی)

ملک صاحب نے اپنی داستان کو پُرشکوہ بنانے کے لیے بادشاہوں میں علاءالدین کو جو سکندر ثانی بننے کا دعوے دار تھا، منتخب کر لیا اور راجاؤں میں رتن سین کو جو ہر اعتبار سے "سرآمد راجگان" تھا۔

(۲) ڈولیوں میں عورتوں کے بجائے راجپوت سپاہیوں کا بیٹھ کر علاؤالدین کے قلعے میں گھس جانے کا جو تذکرہ ملک صاحب نے کیا ہے وہ بھی شیر شاہ ہی کے عہد کا ہے۔ بلکہ خود شیر شاہ کا واقعہ ہے اور قریب اُسی وقت کا جبکہ ملک صاحب مثنوی لکھ رہے تھے ملاحظہ ہو:-

"ہمایوں کو صوبہ بہار سے نکال کر شیر شاہ کو بنگالہ کی ہوس ہوئی مگر اہل و عیال اور خزانے کے لیے متفکر تھا کہ خود مہم پر جائے تو اُن کو کہاں محفوظ چھوڑ جائے؟ قلعۂ رہتاس اپنی عظمت اور مضبوطی کے لیے نہایت مشہور اور اس مقصد کے لیے از حد موزوں تھا۔ آخر بہت غور و فکر کے بعد شیر شاہ نے راجا کو لکھا کہ میں بنگالہ جاتا ہوں اور اپنے اور اپنے سردار و سپاہ کے اہل و عیال اور خزانہ تیری حفاظت اور دوستی کی پناہ میں چھوڑتا ہوں اگر زندہ بچا تو حق خدمت ادا کروں گا۔ ورنہ خزانہ تجھ کو مبارک اور ہمارے ناموس اہل و عیال مغلوں کی بہ نسبت، جو ہمارے دشمن ہیں، تیری حفاظت میں زیادہ محفوظ رہیں گے"۔

"راجا نے اس پیام کو خزانے کے لالچ میں قبول کر لیا۔ ایک ہزار ڈولیوں میں دو ہزار مسلح افغان دو ہزار کہار ڈولیوں کے اور ایک ہزار مزدور خزانے کی اشرفیوں کے جو سب کے سب سپاہی تھے۔ قلعہ

کو روانہ ہوئے آگے کی چند ڈولیوں میں مصلحتاً بوڑھی عورتیں بٹھادی گئی تھیں اُن کی سرسری تلاشی کے بعد تمام زنانہ اور خزانہ قلعے میں داخل کر لیا گیا۔ اندر پہنچتے ہی سوری افغان تلواریں سونت ڈولیوں سے نکل پڑے۔ خزانے کے مزدور اور ڈولیوں کے کہار بھی سپاہی بن گئے اور قلعے کے دروازے شیرشاہ کے لیے جو قریب ہی کان لگائے کھڑا تھا کھول دیے گئے۔ راجا بھاگا اور قلعے پر شیرشاہ کا قبضہ ہوگیا۔ (منقول از فرشتہ)

ملک صاحب نے افغانوں کے واقعے کو راجپوتوں سے منسوب کر کے علاءالدین کے پدمنی کے حصول کی کوششوں کی رد کرنے کو اس کا سبب قرار دے اپنی نظم کو کافی دلچسپ اور ہنگامہ خیز بنا دیا ہے۔

(۳) ملک محمد جائسی ہی کے زمانے میں شیرشاہ کے ہم عصر سلطان بہادر گجراتی نے ۹۳۸ھ میں (پدماوت کی تصنیف سے صرف نو برس پہلے) سلہدی نامی راجا رائسین پر چڑھائی کی تھی۔ مقصد اس لشکرکشی کا یہ تھا کہ راجا کے زنان خانے سے تقریباً ڈھائی سو ایسی مسلمان عورتوں کو آزاد کر دیا جائے جن کو اُس نے اپنے تعیُّش کے لیے محل میں نظر بند کر رکھا تھا۔ جب بچاؤ کی کوئی صورت بن نہ پڑی تو رانی نے ایک بہت بڑی چِتا مشتعل کرائی تاکہ رنواس (محل) کی تمام عورتوں سمیت جوہر[1] کرے اور یہ معلوم کر کے کہ لشکرکشی کا سبب محل کی نظر بند مسلمان عورتوں کو رہائی دلانا ہے۔ اُس نے ان مسلمان عورتوں کو بھی آگ میں زبردستی جھونک دیا۔ جو قلعے میں قید تھیں۔ قلعہ فتح ہُوا۔ لیکن بجز راکھ کے ایک ڈھیر کے سُلطان کو راجا

---

[1] غنیم کے استیلا کے وقت راجپوتوں کی عورتیں اپنی عصمت کی حفاظت کے لیے خود کو نذرِ آتش کر دیتی تھیں۔ اسی کو جوہر کرنا کہتے تھے۔

کے زنان خانے کا نشان بھی نہ ملا۔ چنانچہ شاعر جائسی نے اس غم انگیز واقعے کو علاء الدین کے حملۂ چتّور سے منسوب کر کے پدمنی کے جوہر کرنے کا تذکرہ کر دیا ہے۔

(۴) ایک اور ثبوت بھی پدماوت کے فرضی قصّہ ہونے اور خود شاعر جائسی کے زمانے کے واقعات سے متعلق ہونے کا ہے یعنی یہ کہ عہد علائی میں قلعۂ کھیلنر کا وجود بھی نہ تھا جس کا ذکر ملک صاحب نے کیا ہے۔ البتہ پدماوت کے زمانے میں ایک قلعے کی تعمیر کھیلنر میں ہوئی تھی جو اپنی مضبوطی اور استحکام کی وجہ سے کافی مشہور ہو گیا تھا۔

(۵) ایک بات اور بھی ہے جو علاؤالدین خلجی کے نام کو منتخب کرنے اور اس فرضی واقعے کو اس کی طرف منسوب کرنے کی ضمن میں کہی جاسکتی ہے یعنی یہ کہ عہد علاء الدین کے صدیوں بعد ملک محمد جائسی کے زمانے کے لگ بھگ ایک سلطان مالوہ میں گزرا ہے جس کا نام غیاث الدین خلجی تھا۔ مانڈو اس کا دارالسلطنت تھا اور اُس کی حکومت کے حدود کے ڈانڈے جا بجا چتّور سے ملے ہوئے تھے اور اکثر باہم محاربات رہتے تھے۔ اس کے بارے میں فرشتہ نے لکھا ہے کہ "اُس کو خوبصورت عورتوں کے جمع کرنے کا عجیب شوق تھا۔ ہزاروں خوبصورت عورتوں کا ایک شہر بسایا تھا۔ کسی بدصورت کا گزر نہ تھا۔ عورتیں ہی امیر، وزیر، قاضی، مفتی، کوتوال، محتسب، خزانے دار غرض جملہ عہدوں پر مامور تھیں، عورتیں ہی دُکان داری، نجّاری، آہن گری، پہلوانی، شعبدہ بازی اور دوسرے تمام صنعتوں اور پیشوں کو انجام دیتی تھیں۔ راجاؤں کی بیٹیوں اور امیروں کی دختروں کو زنانے

میں وہی منصب، خطاب اور عہدے ملے ہوئے تھے جو باہر راجاؤں اور امیروں کو حاصل تھے۔ ایک دستہ ترک عورتوں کا مردانہ لباس میں ——اور ایک دستہ حبشی عورتوں کا—— مقرر تھا۔ نیزے لیے ترکش لگائے کمر بستہ پہرہ دیا کرتی تھیں۔

اگرچہ ہزارہا حسین عورتیں اُس کے شہر حسن آباد میں جمع ہو گئی تھیں پھر بھی سلطان کو یہی حسرت تھی کہ جیسے حُسن اور صورت کو دل چاہتا تھا ہنوز میسّر نہیں آتی۔ آخر اس کے ایک مقرّب نے بیڑا اُٹھایا کہ وہ بادشاہ کے واسطے حسین ترین عورت (پدمنی) تلاش کر کے لائے گا۔

چنانچہ اُس کی تلاش میں دیس دیس مارا پھرا آخر مایوس ہو کر پلٹا جب اپنے بادشاہ کے علاقے میں واپس قدم رکھا تو کسی موضع میں ایک دوشیزہ جاتی ہوئی نظر پڑی جس کی رفتار و قامت ہی پر وہ حیران رہ گیا صورت دیکھی تو اپنے مطلوب سے بھی بہتر پایا۔ آخر وہیں رہ پڑا اور جس حیلے سے بھی ہو سکا اُس حسینہ کو اُڑا کر بادشاہ کی خدمت میں لا پہنچایا۔

بادشاہ بھی نہایت خوش ہوا اور بیش قرار صلہ مرحمت فرمایا۔ اسی اثنا میں اُس دوشیزہ کے ورثا بھی فریاد کرتے آ پہنچے اور سرِ راہ بادشاہ سے اُس شخص کے خلاف داد چاہی۔

ورثا کو جب یہ معلوم ہوا کہ لڑکی بادشاہ کے محل میں ہے تو اُنھوں نے باعث شرف و سعادت سمجھ کر بادشاہ کو بخوشی معاف کر دیا۔"

(ماخوذ از فرشتہ)

چنانچہ ملک صاحب نے تمثیل کے اعتبار سے غیاث الدین خلجی کے بجائے علاء الدین کے نام کی تحریف کردی۔ جو شہرت و عظمت میں غیاث الدین سے کہیں زیادہ مشہور تھا اور "پدمنی" یعنی حسین ترین عورت کی جستجو کی کتھا سن کر انھوں نے اپنی بلند فکری سے نظم کی روح و روان کا نام بھی پدمنی رکھ دیا۔

اس کے علاوہ چتوڑ کے ایک ہندی کتبے کی شہادت بھی اس دلیل کی تائید میں موجود ہے۔ جو اودے پور راج میں بطور آثار قدیمہ محفوظ ہے۔ اور وہ اکلنگاجی کے کتبے کے نام سے مشہور ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ کسی بادل[1] گورا نامی سردار نے مانڈو کے غیاث الدین[2] خلجی سلطان مالوہ کو سمبت ۱۵۴۵ (مطابق ۱۴۸۸ء) میں اس جگہ نیچا دکھایا۔ سینکڑوں مسلمان روزانہ قتل کیے۔

جس جگہ وہ قتل کیے گئے وہ برج قلعہ بھی "بادل سرینگا" کے نام سے آج تک مشہور ہے۔

اس کتبے سے میواڑ کے محققین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ملک محمد جائسی کی مثنوی پدماوت میں جو گورا بادل نام کے دو سردار مذکور ہوئے ہیں۔ وہ حقیقت میں ایک شخص ہے یعنی یہی گورا بادل جس کا نام کتبے میں لیا گیا ہے۔ ممکن ہے اس خلجی سلطان مالوہ کو کسی نے چتوڑ کے رانا کے محل میں پدمنی کے وجود کی خبر دی ہو اور اس نے اشتیاق میں چڑھائی

---

[1] گورا میواڑ کے ایک قبیلے کا نام ہے۔

[2] رتن سین خلف رانا سانگا اور غیاث الدین خلجی ہم عصر تھے۔ کہنے کے بموجب گورا بادل نے اسی غیاث الدین کو نیچا دکھایا ہوگا۔

کی ہو۔ محاصرے میں گورا بادل نے اُس کے دانت کھٹّے کیے ہوں لیکن یہ بھی ایک طاقتور سلطان تھا۔ آخر صلح ہوگئی ہو اور رانی کو آئینے میں دکھا دینے کی شرط قرار پائی ہو اور سلطان آئینے میں صورت دیکھ کر چلا گیا ہو۔ لیکن چونکہ واقعہ ذرا دلچسپ تھا۔ اس لیے تخیّلات کو بے لگام دوڑانے کا کافی موقع ملا اور ملک صاحب نے زورِ تخیل کا خوب خوب مظاہرہ کیا۔ چنانچہ اُنھوں نے محمد تغلق کی راجا کھیلہ پر فوج کشی کے نتیجے میں خاندانِ چتّور کی رانیوں کے جوہر کرنے کے اور راجا اور سردار سب کے کٹ مرنے کے واقعے کو بھی اسی سلسلے میں شامل کر دیا۔ ورنہ سلطان مالوہ کے ہاتھوں رانا سانگا اور رتن سین نے بارہا شکستیں کھائیں لیکن کوئی رانا کبھی اُن کے ہاتھوں اتنا تنگ نہیں ہوا۔ کہ رانیوں کے جوہر کی نوبت آئی ہو اور تمام سردار، ٹھاکر، کنور اور رانا کٹ مرے ہوں۔

مندرجۂ بالا وجوہ پر محقّقانہ نظر ڈالنے کے بعد یہ بات صاف نظر آئے گی کہ مثنوی پدماوت کا پورا ڈھانچہ ملک صاحب کے زمانے کے واقعات پر قایم کیا گیا ہی۔ یعنی کچھ حصّہ تو رائے سین کے راجا سہدی کے واقعات سے لیا گیا ہی۔ کچھ شیر شاہ کے قلعۂ رہتاس کو فتح کرنے کے حال سے، کچھ غیاث الدین خلجی کی پدمنی کی تلاش سے کچھ شیر شاہ کے زمانے کے مشہور حالات و واقعات سے کچھ محمد تغلق کے راجا کھیلہ پر فوج کشی سے، اس کے علاوہ اس نظم کی تکمیل میں تخیل کو کچھ کم دخل نہیں دیا گیا۔ چنانچہ مثنوی کے آخر میں ملک صاحب نے خود ہی نظم کو فرضی قصّہ قرار دیا ہی۔ اور کہا ہی کہ "کہانی جوڑ سناوا"

اسی سلسلے میں ایک دوسری جگہ فرمایا ہی کہ قصّہ کہانی کہنا ایسا ہی ہی جیسے دہی میں اسے متھ کر مکھّن نکالنا ورنہ کہاں کی رانی اور کہاں کا راجا یعنی کہاں رانی پدمنی اور کہاں علاؤالدین کا اُس کے حُسن پر فریفتہ ہو کر چتور پر حملہ کرنا۔

غالباً انھیں وجوہ اور قراین کی بنا پر شمس العلما مولوی ذکاءاللہ خاں نے بھی اپنی مبسوط تواریخ ہندستان میں اس قصّے کا خلاصہ دے کر کہا ہی کہ "اس کی شان تاریخی واقعے کی نہیں افسانہ معلوم ہوتا ہی"۔

مؤلف تاریخ ترکتازان ہند (فارسی) نے بھی اس قصّے کو نقل کر کے اعتراض کیا ہی کہ "علاءالدین جیسے سلطان ذی شان کی شان سے یہ امر بعید معلوم ہوتا ہی کہ اُس نے غیر کی زوجہ پر اپنی نیت بد کی ہو غیر کی زوجہ پر نظر اُٹھانا علاءالدین کے قانون کے خلاف تھا۔ وہ ایسے لوگوں کا جو دوسروں کی بیویوں کو تاکیں سخت دشمن تھا۔ ایسا دشمن کہ زانی[1] کو اس نے خصّی کر دینے کا حکم دے دیا تھا اور چونکہ علاءالدین ایسے بادشاہوں میں نہ تھا جو رعایا کو تو ارتکاب جُرم سے منع کریں اور خود اس فعل کے مرتکب ہوں اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ علاءالدین

[1] اس ضمن میں بیانہ کے قاضی مغیث الدین سے علاءالدین کی گفتگو سننے کے قابل ہی۔ ملاحظہ ہو:-

"ماہم چو تو نیز مسلمانیم و مسلمان زادہ ایم۔ ایں کہ سیاستہائے عظیم نرسانم ملک آرام نمی گیرد۔ مردم براہ مستقیم نمی آیند۔ چوں فساق و فجار در زنا حریص اند بز جر و ضرب و قید و حبس ممنوع نہ شوند بواسطہ عبرت باآں کہ نامشروع است، زانی را خصّی می کنم واز آنکہ قصد و نیت من رفاہیت خلق اللہ است امیدوارم کہ حق سبحانہٗ و تعالیٰ گناہم بہ بخشد و در توبہ نیز کشادہ است" (منقول از تاریخ فیروز شاہی)

نے اپنے لیے زنا کو جایز کر رکھا تھا۔ اس کی تایید یوں بھی ہوتی ہے کہ جب کوتوال علاءالملک کے مشورے سے نصیحت پزیر ہو کر اُس نے خلق اللہ کو ترک شراب کا حکم دیا تو بقول (فرشتہ) بادشاہ نے اوّل اپنا عیش خانہ یعنی مجلس شراب بالکل برطرف کر دی۔ اپنے نفیس نفیس شرابوں کے خُم کے خُم دروازے کے آگے لُنڈھوا دیے اور مے کشی کے آلات و ظروف طلا و نقرہ سب گلا کر ان کے رُپے، اشرفیاں ڈھال لیں۔

اس کے علاوہ علاءالدین کا عہد ایسی مثالوں سے بھی خالی نہیں کہ غیر کی حسین و جمیل منکوحہ[1] جنگ کے قیدیوں میں اس کے ہاتھ آئی ہوں اور اس کے قبضے میں یہاں تک پہنچ چکی ہوں کہ حرم سلطانی میں موجود ہو لیکن سلطان نے باوجود رغبت زبردستی نہ کی ہو۔ تاآنکہ اُس نے مذہب اسلام قبول کر کے سلطان سے شرعی تعلق منظور نہ کر لیا ہو۔

پروفیسر حبیب (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے بھی امیر خسرو کی تاریخ علائی یعنی خزاین الفتوح کے انگریزی ترجمے میں فتح چتّور کے حالات کے تحت میں فرشتہ کا لکھا ہوا قصۂ پدمنی فارسی سے نقل کر کے

---

[1] ایک حسینہ گجرات کے راجا کرن کی مشہور و معروف رانی کنولا دیوی تھی جو گجرات کی فتح کے سلسلے میں دیگر تحایف و اموال غنیمت کے ساتھ سلطان کے حضور میں سر دربار پیش کی گئی۔ سلطان نے یہ معلوم کرتے ہی کہ راجا کرن کی زوجہ ہے اس کو فوراً محل میں لے جانے کا اور باعزاز تمام رکھنے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ معہ اپنی ماماؤں کے محل میں پہنچا دی گئی۔ شرعاً جنگ کی قیدی عورتیں کنیز ہونے کی حیثیت سے جایز ہیں۔ سلطان چاہتا تو اُس کو روز اول ہی کنیز بنا کر ڈال لیتا لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا۔

یہ رائے ظاہر کی ہے کہ امیر خسرو کے بیان کے مقابلے میں فرشتہ[1] کا بیان

[1] مثنوی پدماوت عہد فرشتہ کی مشہور تصنیف تھی۔ اُسی سے اخذ کرکے اور اُس میں پیوند لگا کر مؤلف تاریخ فرشتہ نے اس افسانے کا ذکر اپنی تاریخ میں کیا ہے۔ یوں تو فرشتہ کا بیان وہی ہے جو کہ دوسرے مورخین کا لیکن بعض بعض مقامات پر اُنھوں نے ایسے واقعات بھی درج کیے ہیں جو دوسری تاریخوں کے خلاف ہیں مثلاً

۱۔ اُنھوں نے مثنوی اور "کھان راسا" دونوں کے خلاف ڈولیوں میں مسلّح سپاہ کے دلّی جاکر راجا کو قید سے چھڑا لانے کی تدبیر کو راجا کی عقلمند بیٹی سے منسوب کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ رائے سین کے واقعے کی بنا پر چونکہ اُس زمانے میں راجا چتور کی بیٹی عقلمندی میں مشہور ہو رہی تھی۔ فرشتہ نے زبان عام سے یہ مضمون اُڑا کر اُسے علاء الدین کے عہد سے منسوب کر دیا اور اپنی مورخانہ ذمہ داری کا ذرا سا بھی خیال نہ کیا۔

۲۔ راجا کے قید سے بھاگ جانے اور گرد و نواح چتور کو تاخت و تاراج کرنے اور علاء الدین کو عاجز کر دینے کا ذکر کیا ہے۔ گو اس کی تایید میں کرنل ٹاڈ نے بھی فرمائی ہے۔ لیکن خود علاء الدین کے زمانے کے برنی جیسے واقعہ نگاروں کے چشم دید بیانات اور اُن کتبوں سے اس بیان کی تردید ہوتی ہے جن سے ۷۰۹ھ بلکہ اُس کے عرصے بعد یعنی ۷۱۵-۱۶ھ تک چتور میں اسلامی حکومت کے استحکام کا پتہ چلتا ہے۔ بہرحال فرشتہ کا بیان کئی اعتبار سے مجروح ہونے کی بنا پر ناقابل اعتبار ہے۔ ایک اور بات بھی اس سلسلے میں قابل ذکر ہے یعنی یہ کہ سلطان علاء الدین کے پدمنی کے حاصل کرنے کے لیے چتور پر چڑھائی کرنے اور رانی کے خاندانی آن پر اپنی جان دے دینے کا ذکر فرشتہ نے بھی نہیں کیا۔

بہ مشکل ٹھہر سکتا ہی۔

اِس اجمالی گفتگو سے اس قدر تو واضح ہو گیا کہ مثنوی پدماوت از سرتاپا ملک صاحب کے تخیّلات کی رہین منّت ہی لگے ہاتھ مورخین مابعد نے جو کچھ اس افسانے کے متعلق لکھا ہی اُسے بھی پرکھ لیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ ملک صاحب کے تخیلات پر جو حاشیے لگائے گئے ہیں اور جن سے افسانے کو تاریخ بنایا گیا ہی۔ اُن میں اور ملک صاحب کے بیان میں کس قدر فرق ہی۔ اور ملک صاحب کی خوشہ چینیوں نے نقش ثانی کو نقش اوّل سے کس قدر بلند یا پست کھینچا ہی۔

چونکہ ملک صاحب کے عین مابعد کے مورخین میں اس افسانے کی تفصیل کرنل ٹاڈ اور ابوالفضل ہی کے یہاں ملتی ہی اس لیے ہماری تنقید کلیتاً انھیں دو بیانوں تک محدود ہوگی۔ فرشتہ کے متعلق پہلے ہی کہا جا چکا ہی کہ اُس کا بیان نہ قابل اعتبار ہی اور نہ مفصّل اس لیے اُسے نظر انداز کیا جاتا ہی۔

کرنل ٹاڈ نے اپنی تصنیف "تاریخ و روایات راجستھان" میں چتوڑ کے حملے کا ذکر اس طرح کیا ہی — ۱۱ وکرم سمبت ۱۳۳۱ میں لکھی سی چتوڑ کی گدّی پر بیٹھا۔ لکھی سی کی کم سنی کی وجہ سے اُس کا چچا بھیم سی[1]

---

[1] ڈاکٹر ایشوری پرشاد اپنی تصنیف "تاریخ ہند قرون وسطیٰ" (MEDIEVAL INDIA) کی دوسری اشاعت ۱۹۲۸ء مطبوعہ انڈین پریس کے صفحہ ۱۹۶ پر حاشیے میں رقمطراز ہیں کہ ٹاڈ نے بھیم سی غلط لکھا ہی رانا کا نام رتن سین تھا۔ نین سی نے اپنی کہانی (KHAYATA) میں رتن سنگھ لکھا ہی اور یہی ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہی فرشتہ نے بھی رتن سنگھ لکھا ہی۔ حالانکہ صحیح نام نہ بھیم سی ہی نہ رتن سنگھ

اُس کے ولی کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ بھیم سی کی شادی سنہل کے چوہان خاندان میں راجا ہمیر کی لڑکی پدمنی سے ہوئی تھی، جو حُسن و جمال میں آپ اپنی نظیر تھی۔ پدمنی کے حُسن کا چرچا سُن کر علاءالدین نے چتّور پر فوج کشی کی اور لڑائی چھڑ گئی۔ دوران جنگ میں بادشاہ نے کہلوا بھیجا کہ اگر مجھے پدماوتی کے درشن ہو جائیں تو میں دلّی پلٹ جاؤں۔ اس پر یہ طے ہوا کہ علاءالدین پدمنی کا عکس دیکھ سکتا ہے۔ اس قرارداد کے بعد لڑائی ختم ہو گئی اور علاءالدین پدمنی کی صورت دیکھنے کے لیے قلعے میں گیا۔ قلعے سے پلٹتے وقت راجا بھیم سی بادشاہ پر اعتماد کر کے آخری پھاٹک تک پہنچانے آیا تھا کہ علاءالدین کے سپاہیوں نے جو پہلے ہی سے گھات میں لگے ہوئے تھے، راجا کو قید کر کے شاہی خیموں میں نظر بند کر دیا، اور اس طرح بھیم سنگھ کو اپنے قبضے میں کر کے اس کی رہائی کو پدمنی کے حصول پر منحصر کیا۔ راجا کے قید ہو جانے کی خبر سُن کر سارے چتّور میں ایک تلاطم برپا ہو گیا اور پدمنی نے اپنے میکے کے دو نامور سرداروں یعنی گورا اور بادل سے طلب اعانت کی۔ گورا پدمنی کا چچا ہوتا تھا اور بادل اس کا چچازاد بھائی اور گورا کا بھتیجا تھا۔ اِن دونوں کی رائے کے مطابق علاءالدین کے پاس پیام بھیجا گیا کہ پدمنی آئے گی مگر رانیوں کی طرح، اس لیے تمام شاہی فوج ہٹا دی جائے اور پردے کا پورا پورا انتظام کر دیا جائے۔ اور یہ بھی کہلوا دیا کہ پدمنی کے ہمراہ بہت سی کنیزیں بھی ہوں گی اور اُس کی سہیلیاں بھی اُسے رخصت کرنے کے لیے ساتھ جائیں گی چنانچہ سات سو پالکیاں علاءالدین کے خیمے کی طرف چلیں ہر ایک پالکی میں ایک ایک راجپوت بیٹھا تھا۔

ہر پالکی اُٹھانے والے چھ کہار تھے۔ جو دراصل سپاہی تھے۔ یہ پالکیاں جب خیمے کے قریب پہنچیں تو قناتیں گھیر دی گئیں تاکہ اندر سواریاں اُتار دی جائیں۔ شاہی محل میں داخل ہونے سے پہلے پدمنی کو اپنے شوہر سے ملنے کے لیے صرف آدھ گھنٹے کی مہلت دی گئی۔ بھیم سی کے لیے ایک تیز گھوڑا پہلے سے تیار تھا۔ وہ اس پر سوار ہو کر اُسی وقفے میں جو اُسے اپنی بیوی سے ملنے کے لیے دیا گیا تھا، گورا بادل اور کچھ دوسرے ساتھیوں کے ساتھ چتوڑ گڑھ کے اندر پہنچ گیا۔ باقی راجپوت بھی ساتھ ہی ساتھ پالکیوں سے کود پڑے اور اُنھوں نے دیر تک شاہی فوج کو تعاقب سے باز رکھا۔ یہاں تک کہ ایک ایک کر کے سب مارے گئے۔ پھر کیا تھا، جب کوئی روک ہی نہ رہی تو شاہی فوج قلعے کے پھاٹک تک پہنچ گئی۔

پھاٹک پر خوب لڑائی ہوئی اور راجپوتوں نے گورا اور بادل کی سرکردگی میں خوب خوب دادِ شجاعت دی۔ یہاں تک کہ شاہی لشکر ہزیمت پا کر دِلّی پلٹا۔ راجپوتوں کو اس لڑائی میں فتح تو ضرور ہوئی۔ لیکن چتوڑ کے چیدہ بہادر سب قتل ہو گئے، اِن میں گورا[1] بھی تھا۔ بادل کی عمر صرف ۱۲ سال کی تھی۔ مگر وہ بڑی دلیری سے لڑا اور صحیح و سلامت واپس بھی آیا۔ اپنے شوہر کے بہادری سے جان دینے کا حال سُن کر گورا کی بیوی ستی ہو گئی اس شکست کے بعد سمبت ۱۳۳۶ (مطابق سنہ ۱۲۸۰ء) میں علاء الدین نے چتوڑ پر پھر

---

[1] گورا بادل ایک ہی نام ہیں ملاحظہ ہو (صفحہ ۱۱۶)

فوج کشی کی[1]۔ اس لڑائی میں رانا کے گیارہ فرزند کام آئے وہ خود بھی مارا گیا اور رانی پدمنی بھی ستی ہو گئی۔"

ٹاڈ کا یہ بیان راجپوت تذکرہ نویسوں کے مطابق ہی اور دو ایک مقاموں کے علاوہ اُس تفصیل سے بھی ملتا جلتا ہی جو ابوالفضل نے چتّور کے حملے کے سلسلے میں آئین اکبری میں دی ہی۔

آئین اکبری میں بھیم سی کے بجائے رانا کا نام رتن سی (رتن سنگھ یا رتن سین) لکھا ہی اور رانا کے مارے جانے کا ذکر بھی ابوالفضل نے دوسرے عنوان سے کیا ہی۔ وہ لکھتا ہی کہ "جب دوسری لڑائی میں بھی علاءالدین ناکامیاب رہا تو اُس نے صلح کا پیغام بھیج کر رتن سی کو ملنے کے لیے بلایا۔ علاءالدین کے بار بار چڑھائیوں سے رتن سی تنگ آچکا تھا۔ اسی وجہ سے جب صلح کا پیغام ملا تو ملاقات کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ غرض ایک شخص کو وہ ساتھ لے کر علاءالدین سے ملنے کے لیے گیا۔ وہاں اُس کے ساتھی نے دھوکا دیا اور رانا

---

[1] علاءالدین نے حملۂ اول ہی میں چتور فتح کر لیا تھا۔ جیسا کہ حضرت امیر خسرو کی اس بیت سے ظاہر ہوتا ہی جو تسخیر چتور ہی کے متعلق آپ کی مثنوی دولرانی وخضر خاں میں مندرج ہی۔

بدولت کرد زاں پس عزم چتّور　　خرابی داد آں ہم را بہ یک دور

"بہ یک دور" سے ظاہر ہی کہ قلعۂ چتور ایک ہی یورش میں لے لیا گیا تھا۔ کوئی دوسری لشکر کشی ۱۳۱۲ء تک بلکہ اُس کے بعد بھی نہیں ہوئی۔ ورنہ خزاین الفتوح یا تاریخ فیروز شاہی میں اس کا ذکر ضرور ہوتا۔

مار ڈالا گیا۔ اُس کے قتل کے بعد آرسی تخت نشین ہؤا۔ بادشاہ نے چتوڑ کی بے سروسامانی سے فایدہ اٹھایا اور قلعے پر حملہ کر دیا۔ آرسی مارا گیا اور پدمنی سب عورتوں کے ساتھ ستی ہو گئی" ان دونوں بیانوں کو پیشِ نظر رکھ کر اس قصّے کی افسانوی حقیقت سے قطع نظر کر کے نظم پدماوت کو ملاحظہ فرمائیے تو ملک صاحب کے بیان میں کئی جگہ اختلاف ملے گا۔ مثلاً یہ کہ شاعر جائسی نے ٹاڈ کی تاریخ کے خلاف بجائے بھیم سی کے رتن سین لکھا ہی، ملک صاحب نے لکھا ہی رتن سین کنبھل نیر کے راجا دیو پال کے ہاتھ سے مارا گیا۔ حالانکہ اِن بیانات میں یہ ہی کہ وہ مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہؤا یہ دوسرا سوال ہی کہ لڑائی میں مارا گیا، یا دھوکے میں پدماوت میں شرط صلح یہ لکھی ہی کہ سمندر کی لڑکی لکشمی کے دیے ہوئے تحفے علاء الدین کو ملیں۔ حالانکہ دوسرے بیانوں میں بھی عکس دیکھنے کی شرط لکھی گئی ہی۔ ملک محمد نے بھی بادشاہ کو پدماوتی کا عکس آئینے میں دکھلایا ہی لیکن شرط صلح کی بنا پر نہیں بلکہ محض حسن اتفاق سے، راگھو کا ذکر بھی ملک محمد ہی کے زور تخیّل کا نتیجہ ہی۔ بعد کے تذکروں میں اس کا کہیں بھی پتہ نہیں۔ رانا کو بجائے اس کے کہ شاہی خیموں میں قید کرتے ملک صاحب نے دلّی میں نظر بند کیا ہی۔

یہ ہیں وہ باتیں جو ابوالفضل اور ٹاڈ کے بیانات کے خلاف ملک صاحب کی نظم میں پائی جاتی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہی کہ آیا ان اختلافات کو پیدا کر کے ملک محمد جائسی سے اخذ کرنے والے بزرگوں نے اس افسانے کو بلند کیا ہی یا پست۔

جہاں تک رانا کے نام کا تعلق ہی۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہی

گو عہد علاء الدین میں دراصل کوئی رانا اس نام کا چتوڑ میں نہ تھا لیکن چونکہ ملک محمد جائسی کے بیان کی بنا پر عام مورّخ متفق ہیں کہ والیٔ چتّوڑ کا نام رتن سین یا رتن سنگھ تھا۔ ایسی صورت میں ٹاڈ کی شہادت محض اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ ٹاڈ نے راجا کے نام کے بارے میں ملک محمد جائسی سے اخذ نہیں کیا۔ اور اس تقلید نہ کرنے کی وجہ سے ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے جیسا کہ عرض کیا جا چکا اِس کا بتایا ہوا نام غلط ٹھہرا دیا اور ملک صاحب کے بتائے ہوئے نام کو صحیح قرار دیا رہ گئیں اور باتیں، سو اُنھیں بھی یکے بعد دیگرے جانچ لیجیے ملک صاحب نے محض ضمنی طور پر پدماوتی کے عکس کو آئینے میں دکھا کر جس بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے وہ غالباً اُن کے متبعین کے پیش نظر نہ رہ سکی۔ تبھی تو اُنھوں نے عزّت اور آبرو کے تمام خیالات کو فراموش کر کے پدماوتی کے چہرے کو آئینے میں راجا کی رضا مندی سے دکھائے جانے کا افسانہ جوڑ دیا۔ حالانکہ اس قسم کا اضافہ بجائے مورخین کے ملک صاحب کے لیے زیادہ موزوں ہوتا کہ اُس اضافے سے اُن کی کہانی زیادہ دلچسپ ہو جاتی۔ لیکن ملک صاحب کی انسانیت اور غیرت یہ گوارا نہ کر سکتی تھی کہ داستان کی روحِ رواں یعنی رتن سین کی کسی انسانی یا اخلاقی کمزوری کو دکھا کر اُسے دنیا کے سامنے سُبک کریں۔ یہی وجہ تھی کہ اس خیالی تصویر کشی میں اُنھوں نے اپنے ممدوح کا کچھ بھی ذکر لاتے وقت کافی احتیاط برتی ہے۔

مثلاً۔ رتن سین کا اس بات پر راضی ہو جانا کہ ایک نا محرم اُس کی رانی کا چہرہ دیکھے، خواہ وہ آئینے ہی میں کیوں نہ ہو،

ملک صاحب نے اپنے ممدوح کے لیے گوارا نہ کیا اور اُس کو بچانے کے لیے اُنھوں نے سمندر کی لکشمی کے دیے ہوئے پانچ تحایف کا ذکر اپنے زورِ تخیل کی بنا پر کر دیا اور اسی کو صلح کی شرط قرار دیا۔ حالانکہ غیاث الدین خلجی کا آئینے میں رانی کا مُنہ دیکھنے والا قصہ اُن کے پیشِ نظر تھا جسے اُسی طرح کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا تھا جیسے بعد کے مورخین نے اُسے استعمال کیا لیکن ملک صاحب نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس ٹکڑے کو اس حسین انداز سے پیش کیا کہ نہ پدمنی کو غیرت پر آنچ آئی نہ رتن سین کی آبرو پر۔ چنانچہ اس مقصد کو پورا کرنے یعنی اپنے ممدوح کے اخلاق اور وقار میں فرق نہ لانے کی غرض سے ملک صاحب نے نظم میں ایک فرضی شخص راگھو کا اضافہ کر دیا جس کے بغیر ملک صاحب پدماوت کا عکس علاءالدین کو دکھا نہ سکتے تھے۔ راگھو گھر کا بھیدی تھا وہی بتا سکتا تھا کہ وہ تمام عورتیں جو بادشاہ کو دیکھنے کے اشتیاق میں متجسّسانہ انداز میں جمع ہوئی تھیں ان میں پدماوتی نہیں ہے اور بادشاہ اُسی سے پوچھ بھی سکتا تھا۔ چتّور کے کسی دوسرے آدمی سے بادشاہ یہ سوال اخلاقاً نہ کر سکتا تھا کہ اُن عورتوں میں پدمنی کون سی ہے۔

ملک صاحب نے رتن سین کا محبس بجائے خیمے کے دلّی قرار دے کر ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ راجا کو دلّی پہنچا دینے کے بعد انھیں موقع ملا کہ وہ رانیوں کے رنج و غم کا خاکہ کھینچیں۔ قاصدوں اور جاسوسوں کو چتّور روانہ کریں۔ پدمنی کے پاس دیوپال کا پیغام پہنچائیں۔ اور گورا بادل کی بہادری کو دل کھول کر

بیان کریں۔ گو اِس سے ملک محمد کا مطلب رتن سین کی رانیوں کی محبت اور بادل کی کم سِنی اور دلیری کی نمایش بھی تھی۔ لیکن اصل غرض ان کی یہ تھی کہ وہ دیو پال کو پیش کر سکیں تاکہ رتن سین کو چتّوڑ واپس لانے کے بعد قبل اِس کے کہ شاہی لشکر چتوڑ پہنچے اُسے دیو پال کے مقابلے کے لیے بھیج کر رانا کی غیرت اور حمیت کا ثبوت بھی دیں اور اُس کو شاہی فوج کے ہاتھوں مارے جانے کی ذلّت سے بھی بچا سکیں۔

غرض ملک صاحب نے ہر جگہ نظم کے حُسن و قبح کا لحاظ کرتے ہوئے افسانوں میں واقعات کا رنگ بھرا ہی۔ کہیں نظم میں حُسن پیدا کرنے کے لیے کہیں مخصوص افراد نظم کی سیرت کو بلند کرنے اور اُن کے وقار کو قایم رکھنے کی غرض سے اور کہیں درس اخلاق دینے کے لیے اور یہ سب اُنھوں نے اس انداز سے کیا ہی کہ سارا افسانہ واقعہ معلوم ہونے لگا۔

ع ۔ عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

البتہ جیسا کہ ظاہر ہؤا ملک صاحب کے خوشہ چیں اس افسانے کو تاریخ کے صفحات پر جگہ دیتے وقت نقش ثانی نقش اول سے بہتر نہ بنا سکے۔

شاعر جائسی کا نظریۂ محبّت

محبّت کے مختلف عنوان ہوتے ہیں مثلاً زن وشو کی محبّت جو عموماً تعلّقات قایم ہونے سے شروع ہوتی ہی اور بعد میں اس حد کو پہنچ جاتی ہی کہ عورت اپنے مرد کے لیے ہر قسم کی زحمتیں

اُٹھانے کے لیے تیار ہو جاتی ہے اور یہی حال اکثر مرد کا بھی ہوتا ہے۔ عورت کے نزدیک مرد اُس کی دنیا ہوتی ہے اور مرد کے لیے عورت سکون کا باعث۔ اس قسم کی محبت کی مثال رام اور سیتا ہیں۔ رام کی جلاوطنی کے زمانے میں سیتا جی کا اُن کے ساتھ جنگل کی مصیبتیں سہنا۔ پھر راون کے سیتا کو ہرلے جانے کے بعد ایک طرف سیتا کا پریشان رہنا اور دوسری طرف رام کا سرگردان پھرنا زن وشو کی محبّت کا بہترین نمونہ ہے —— یا ایسی محبت جو بہ یک نظر پیدا ہو جائے مثلاً شکنتلا اور دشینت کی محبت کہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہی دل دے بیٹھتے ہیں —— یا وہ بوالہوسانہ جذبہ جسے سطحی نظر سے دیکھنے والے محبت کا نام دے دیتے ہیں لیکن جس کا انجام چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیرا پاکھ سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا —— یا وہ محبّت جس کے لیے کہا گیا ہے کہ "بسا کین دولت از گفتار خیزد" پدماوت میں اسی محبت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ رتن سین توتے کے مُنہ سے پدماوتی کی تعریف سنتا ہی فریفتہ ہو جاتا ہے اور جوگی بن کر اس کی تلاش شروع کر دیتا ہے۔ اس قسم کی محبت گو فارسی عشق کے مطابق ہے جہاں فرہاد شیریں کے لیے پہاڑ کھودڈالتا ہے یا مجنوں لیلیٰ کے لیے دشت دشت مارا پھرتا ہے مگر ہندی طریقۂ عشق کے خلاف ہے جہاں عورت مرد سے عشق کرتی ہے اور اس کی جُدائی میں پریشان رہتی ہے۔ شاعر جائسی نے جہاں اس رواج سے علیحدگی اختیار کی ہے وہاں پدماوتی کو بھی اتنا ہی بے قرار دکھا کر ہندی طریق محبت کا نمونہ بھی پیش کر دیا ہے اور اس طرح فارسی

اور ہندی محبّت کے دو متضاد نمونوں کو ایک ہی مقام پر اکٹھا کر دیا ہی۔ پدمنی کی محبّت اور عشق کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہی کہ رتن سین کے سولی پر لٹکا دینے کا حکم سُن کر وہ بال بکھرائے اور مُنہ پر دھول ڈالنے لگی یا بعد میں اُس سے جدا ہو کر دیوانہ وار پھرنے لگی۔ رتن سین پہلی مرتبہ اس محبّت کی دیوی کو دیکھ کر جب غش ہُوا ہی اُس وقت جو الفاظ پدماوتی کے مُنہ سے نکلے ہیں وہ اس کی حقیقی محبت کے شاہد ہیں اور ہندی طریق عشق کے گواہ۔ وہ کہتی ہی۔

"جوگی تو نے بھیک حاصل کرنے کے لایق جوگ نہیں سیکھا جب بھیک کا پھل حاصل کرنے کا وقت آیا تو سو گیا" محبت میں فراق اور وصال کی جو تصویریں پیش آتی ہیں اس کا خاکہ بھی ملک صاحب نے خوب کھینچا ہی۔

فراق جس عنوان سے شاعر جائسی نے فراق کا ذکر کیا ہی اُس میں مبالغہ آمیزی کے باوجود سنجیدگی اور متانت پائی جاتی ہی۔ اُن کا مبالغہ بات کا بتنگڑ نہیں معلوم ہوتا اور اس میں ایسی تڑپ ہی جو ہمسایوں کو بے چین کر دے اور پھولوں کو خاک سیاہ اور پانی کو آگ بنا دے ـــــ البتہ شاعر کے درد کا باطنی پہلو جتنا روشن ہی اتنا ظاہری پہلو نہیں ہی درد کے ظاہری پہلو کی مثالیں بھی اُن کے کلام میں ہیں مثلاً راجا کے درد محبت کا ذکر اُنھوں نے یوں کیا ہی۔

آکھر[1] جرنہہ نہ کاہو چھوا تب دُکھ دیکھ چلا لے سوا

ترجمہ۔ حرف اس طرح جلتے تھے کہ کوئی خط کو چھو نہ سکتا تھا یہ دیکھ کر

---

[1] आखर जरीह न काहू छुआ। तब दुःख देखि चला ले सुआ ॥

توتا چلّایا۔ یا ناگمتی کی حالت فراق کا تذکرہ ان لفظوں میں موجود ہی۔
جیہہ پنکھی کے نیر ہو کہے برہ کے بات[1] سوئی پنکھی جائے جر ترور ہوی نپات
ترجمہ۔ جس پرند کے نزدیک ہو کر ہجر کا حال کہتی ہوں۔ پرندہ اور درخت دونوں جل جاتے ہیں۔ پتہ نہیں چلتا۔ مگر یہ اُن کا امتیاز نہیں ہی۔ اُن کی خصوصیت تو باطنی پہلو کا اظہار ہی۔ چنانچہ انھوں نے یہ کم کہا ہی کہ جدائی کا درد اتنا قوی ہی لیکن یہ زیادہ کہا ہی کہ درد فراق ایسا مؤثر ہی۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں۔
لاگیوں جرے[2]، جرے جس بھارو پھر پھر بھونجس تجیون نہ بارو
ترجمہ۔ مَیں تمھاری لگن میں ایسی جلی ہوں جیسے بھاڑ میں دانہ — کہ بار بار جلتا اور بُھنتا ہی مگر بالو کو نہیں چھوڑتا۔ فراق نے رہ رہ کر مجھے جلایا لیکن مَیں نے تجھے نہ چھوڑنا تھا نہ چھوڑا۔

یہاں محبت کی مقدار نہیں بتائی گئی نہ اس کی ناپ کا کوئی پیمانہ بتایا گیا ہی نہ وہ محبت جس کا ذکر ملک صاحب نے کیا ہی وہ ایسی ہی جسے ناپا جائے یہ محبت تو دل ہی میں پیدا ہوتی ہی وہیں رہتی ہی وہیں بڑھتی ہی اور وہیں رہ کر عاشق کو نیست و نابود کر دیتی ہی —— شاعر جائسی نے جدائی کا ذکر جس عنوان سے کیا ہی اُس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہی کہ اُن کی محبت باطنی ہی

---

[1] जेहि पंखी के नियर होइ, कहै विरह कै बात।
सोई पंखी जाय जरि, तखिर होहि निपात॥

[2] लागिउं जरै जरै जस भारू।
फिरि फिरि भूंजेसि तजिउँ न बारू॥ (पदमावत)

نہ کہ ظاہری۔

چنانچہ "پریم یوگی" رتن سین کی رخصت کے وقت جس طرح انسانی دل دو نیم ہیں اُسی طرح چاند، جنگل کے پیڑ، جانور، پرند، پتھر بھی افسردہ دل نظر آتے ہیں۔ اسی طرح جب ناگمتی کی آنکھ سے فراق کے آنسو گرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا مغموم ہے۔ ناگمتی کا دردِ فراق ہندی ادب کا ایک نایاب گوہر ہے۔ ناگمتی پیڑوں کے نیچے رات بھر روتی پھرتی ہے اور پرند اور پیڑ غرض جو بھی اس حالتِ غم میں اُس کے سامنے آتا ہے اُسے وہ اپنا دُکھڑا سناتی ہے اور سننے والوں کی خاموشی سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اثر لے کر داستانِ الم سُن رہے ہیں۔

کیا کہنا محبت کی اس منزل کا جہاں غیر اپنے معلوم ہونے لگیں اور بیگانوں میں یگانگت پائی جائے۔ دوسرے شاعروں نے پرندوں سے تخاطب کرنے کے بعد اُن سے کوئی مدد نہیں لی مگر شاعر جائسی نے اُن کے دلوں میں بھی انسانی ہمدردی کا جذبہ پیدا کر دیا ہے۔ رام کے پرند جواب نہیں دیتے لیکن جب ناگمتی[۱] جنگل[۲]

۱؎ کہک کہک جس کوئل روئی   رکت آنسو گھنگچی بن بوئی

ترجمہ۔ کہک کہک کے کوئل کی طرح روئی اور اشک خونیں نے گھنگچی سے جنگل بھر دیا۔

कुहुकि कुहुकि जस कोयल रोई । रकत आँसु घुघची बन बोई ॥

۲؎ پھر پھر روئی کوئی نہ ڈولا   آدھی رات بہنگم بولا۔

ترجمہ۔ بار بار روئی لیکن کوئی نہ لٹکا آدھی رات کو بہنگم بولا۔

फिरि फिरि रोय कोइ नहि डोला । आधी राति विहंगम बोला ॥

روتی پھرتی ہی تو آدھی رات کو بہنگم پرند بولتا ہی اور پوچھتا ہی[1] کہ کس سبب سے رات بھر آنکھ نہیں لگاتی یہی نہیں بلکہ حالات معلوم کرنے کے بعد پیام لے جانے پر بھی تیار ہو جاتا ہی۔

فراق کا جتنا بھی ذکر پدماوت میں ملتا ہی اس کا بہترین حصّہ ناگمتی کا بارہ ماسہ ہی جس کا ترجمہ آخر کتاب میں شامل ہی اس میں مختلف قسم کے تاثرات فراق ملتے ہیں آدمی کے لگائے ہوئے پھول پھل پودے کس طرح اُس کے غم اور خوشی میں شریک رہتے ہیں اس کا ذکر بھی بارہ ماسے میں موجود ہی۔

چنانچہ جدائی کے زمانے میں ناگمتی کا سارا باغ سوکھ جاتا ہی۔ اُس میں کوئی دل کشی باقی نہیں رہتی لیکن رتن سین[2] کے چتّوڑ واپس آتے ہی سرسبز و شاداب ہو جاتا ہی۔

فراق کا تذکرہ کرتے وقت ملک صاحب نے اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا کہ فراق میں دُکھ اور سکھ دونوں تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ بلکہ اچھی چیزیں غم کو اور بڑھا دیتی ہیں۔ جدائی کا مرض ایسا نہیں ہوتا کہ گرد و پیش کی خوشنما چیزوں سے دل بہلے اُن سے تو غم میں اور بھی اضافہ ہوتا ہی۔ ناگمتی دیکھتی ہی

---

[1] کیہہ دُکھ رین نہ لاوس آنکھی

ترجمہ۔ کس کے درد سے رات بھر آنکھ نہیں لگاتی۔

केहि दुख रैनि न लाविस आँखी (पदमावत)

[2] पलटी बागमती कैवारी ।
सोने फूल फूलि फुलवारी ॥

کہ سب کے بچھڑے ملتے ہیں مگر اُس کا پیارا نہیں پلٹا تو کس حسرت سے کہتی ہی کہ "کنت نہ پھرے بدیسا بھوے" یعنی شوہر نہ پلٹا پردیس میں بھول گیا۔ اسی غم فراق میں وہ یہ بھی بھول جاتی ہی کہ پدماوتی ہی اُس کی پریشانی کا باعث ہی۔ اس کو بہنگم پرندے کے ہاتھ یہ پیغام کہلا بھیجتی ہی۔

موہے[ل] بھوگ سوں کاج نہ باری سونھ دشٹ کے چاہن ہاری

ترجمہ۔ مجھے عیش و عشرت کی خواہش نہیں ہیں تو فقط دید کی خواہاں ہوں۔

جدائی کے عالم میں ناگمتی تمام خودداریوں کو بھول جاتی ہی اور پرندوں اور چرندوں کو بھی نہایت عجز کے ساتھ مخاطب کرتی ہی۔ "بھونرا" اور "ہے کاگ" کا انداز تخاطب داد سے بے نیاز ہی۔

غرض جائسی نے جدائی کا جو خاکہ پیش کیا ہی وہ بہت مؤثر ہی اور چونکہ ناگمتی کی داستان فراق بیان کرنے میں ملک محمد جائسی نے ہندی مذاق اور ادب کا بہت لحاظ رکھا ہی اور فارسی ادب کی جھلک کم آسکی ہی اس لیے داستان اور بھی مؤثر ہوگئی ہی۔

وصال ذکر فراق کی طرح پدماوت میں تذکرۂ وصال بھی آیا ہی اور ناگمتی کی دلدوز آہوں کے بعد ہی ہم کو نغموں کی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں۔

[ل] मोहि भोग सौं काज न वारी।
सौंहि दिस्टि कै चाहन हारी॥
(पदमावत)

غم کی فطری پائیداری اور پھر اس پر ناگمتی کی کوک ایسی نہیں کہ انسان اس غم کے اثر کو فوراً کسی دل خوش کُن داستان کے سنتے ہی فراموش کر دے البتہ اضمحلال اس کا متقاضی ضرور ہوتا ہے کہ اب یہ آہیں نہ سُنائی دیں تو اچھا ہے۔ چنانچہ ملک محمد جائسی نے اس ضرورت کو پورا کیا ہے اور ایسا کر کے اُنھوں نے نظم میں چار چاند لگا دیے ہیں اس بر محل مقابلے نے وصال کے لُطف اور فراق کے غم دونوں کو بڑھا دیا ہے۔ شادی کے بعد رتن سین اور پدماوتی کے وصال کا ذکر پدماوت میں اتنے ہی تفصیل کے ساتھ جتنی وضاحت کے ساتھ ناگمتی کے فراق کا ذکر کیا گیا ہے۔ پدمنی کا سنگار کر کے رتن سین کے پاس آنا اس حصۂ نظم کا ایک خاص اور دلفریب جزو ہے جس میں محاکات کا کافی زور موجود ہے۔

وصل کی شب پہلے تو کچھ اور باتیں ہوتی ہیں اُن کے بعد راجا اُن مشکلات کا تذکرہ چھیڑتا ہے جو اُسے راہ میں پیش آئی تھیں۔ غالباً پدماوتی کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے۔

لیکن راجا کی ساری کہانی سننے کے قبل ہی بجائے ہمدردی کے وہ اظہار نفرت کرتی ہے اور کہتی ہے کہ مَیں رانی اور تو جوگی میرا تیرا کیا ساتھ۔

مگر ان بے اعتنائیوں کے باوجود بھی رتن سین اپنا قصۂ الاپتا ہی جاتا ہے اور دردِ اُلفت کے اظہار میں مصروف رہتا ہے یہاں تک کہ پدمنی رتن سین کی محبت کا اندازہ کر کے اس کی جانفشانیوں کی داد دیتی ہے اور اُسے سراہنے لگتی ہے۔

یہی وہ منزلِ معرفت ہے جہاں پہلے خدا ہمیں اچھا معلوم ہوتا ہے اور بعد کو ہم بھی خدا کو اچھے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ پہلے رتن سین کو پدمنی سے محبّت ہوتی ہے بعد میں پدمنی بھی محبّت کرنے لگتی ہے۔ اس سلسلے میں شاعر جائسی نے جسمانی لُطف اندوزی کا جو خال خال ذکر کیا ہے اس میں بھی محبت کی مٹھاس کو قایم رکھا ہے جس کی وجہ سے یہ تذکرہ مذاق سلیم پر گراں نہیں گزرتا۔ ملاحظہ ہو ایک جگہ فرماتے ہیں۔

گرجے گگن چونک کنٹھ لاگے

ترجمہ۔ جب بادل گرجتا ہے تو چونک کر شوہر کے گلے لگ جاتی ہے۔

ناگمتی کو جو بوندیں فراق میں تیر سی لگتی ہیں پدمنی کو وہی بوندیں لُطف دیتی ہیں۔ فراق اور وصال میں اتنا فرق۔

پدماوت کا مرتبہ ہندی ادب میں

پدماوت اپنی ٹھیٹھ زبان، بے عیب طرزادا، ترتیب و تسلسل، سادہ سیرت اور وصف نگاری کے اعتبار سے ہندی ادب میں ایک نمایاں درجے پر فایز ہے اور ہندی زبان کی پریم کہانیوں میں[1]

[1] ہندی زبان میں جو پریم کہانیاں لکھی گئی ہیں اُن کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ "بیر گاتھا"	۲۔ "پریم گاتھا"	۳۔ "جیون گاتھا"
پرتھوی راج راسو	مرگاوتی۔ اندراوتی	رام چرت مانس
مصنفہ	چتراوتی پدماوت مصنفہ	مصنفہ
چند بردائی	نور محمد عثمان، قطبن، ملک محمد	تلسی داس

(علی الترتیب)

پدماوت سربلند نظر آتی ہی۔ مرگاوتی، اندراوتی، چتراوتی وغیرہ کو لوگ کم جانتے ہیں لیکن پدماوت ہندی ادب کا جگمگاتا موتی ہی

بلاغت اور دیگر محاسن شاعری کے لحاظ سے بھی پدماوت کا شمار اونچے درجے[1] کی تصانیف میں کیا جاتا ہی۔ ٹھیٹھ اودھی زبان کا علم حاصل کرنے والوں کے لیے ایک بے بہا گوہر ہی۔ یہ ایک وسیع نظم ہی۔ ایک شاعرانہ نظم ہی۔ یہ ایک تاریخی نظم ہی۔ ایک صوفیہ نظم ہی۔ ایک اخلاقی نظم ہی۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر یہ اُردو اور ہندی کے درمیان ایک رشتہ ہی کتنا نازک اور پھر بھی کتنا قوی۔ اُردو کے ارتقا کی تاریخ کا دیباچہ ہی کتنا حسین اور سیر حاصل دیباچہ۔ آج سے تین چار سو برس قبل کے تمدن اور معاشرت کا آئینہ ہی۔ کتنا روشن آئینہ۔ حکمت و موعظت کا دفتر ہی۔ جذبات واحساسات کا خزانہ اور مفید معلومات حاصل کرنے کا ذریعہ۔ جب تک ایک بھی ہندی داں موجود ہی پدماوت کا نام باقی رہے گا اور جب تک حسن وفا اور ایثار کا شمار بلند ترین انسانی صفات میں ہوگا۔ اس وقت تک پدماوت ایسی نعمت سمجھی جاوے گی جس کی قیمت کا اندازہ مشکل سے لگایا جا سکے گا۔

پدماوت پر ایک سرسری نظر

ا۔ حسن ترتیب۔ ترتیب کے اعتبار سے پدماوت کو ہم تین

---

[1] پدماوت کی مقبولیت کا شاید کچھ اندازہ اس سے ہو سکے کہ تصنیف ہونے کے سو ہی سال کے اندر اس کی شہرت اراکان ایسے دور دراز مقام تک پہنچ گئی تھی اور علما و فقہا تک اس کی قدر کرتے تھے۔

حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پدماوتی کی پیدایش سے رتن سین کے محاصرہ سنہل گڑھ تک ابتدا۔ شادی سے لے کر سنہل دیپ سے رخصت ہونے تک وسطا اور راگھو چیتن کی جلا وطنی یا چتّوڑ واپس آنے سے پدمنی کے ستی ہونے پر خاتمہ ـــــ بیچ بیچ میں جو ضمنی تذکرے جملہائے معترضہ کے طور پر آگئے ہیں وہ اصل قصّے کو دبانے اور اس پر چھاؤں ڈالنے کے بجائے اُس میں تسلسل پیدا کرتے ہیں اور اُسے خاص انداز سے آگے بڑھاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہیرامن کی خریداری کا ذکر راگھو چیتن کا حال، بادل کا تذکرہ یا دیوپال کی کٹنی کا منصۂ شہود پر لانا۔ ان ٹکڑوں میں آپس کا ایک خاص لگاؤ پایا جاتا ہے اور یہ حصّے نظم سے غیر متعلق اور غیر ضروری نہیں معلوم ہوتے۔ یہی حال ناگمتی کے بارہ ماسے کا ہے۔ اگر ان میں سے ایک کو بھی نظم سے علیحدہ کر لیا جائے تو نظم ایک قالب بے جان بن کر رہ جائے نہ نظم میں دل کشی باقی رہے نہ تسلسل۔ البتہ کہیں کہیں ایسے اذکار بھی آگئے ہیں جو نظم کے موضوع اور مقصد کے اعتبار سے فی الحقیقت غیر ضروری اور غیر متعلق ہیں۔ اور پدماوت ایسی شاہکار کے شایان نہیں۔ مثلاً گھوڑوں کے اقسام، پھل پھولوں کے نام، سولہ سنگار، جوتش اور علم نجوم کی بھرمار یا پدماوتی کے مُنہ سے "تولہ رنگ نہ راںچے جو لگ ہوئے نہ چون" (بغیر چونے کے رنگ نہیں چڑھتا) نکل جانے پر پانوں کی قسموں کو گنوانا یا محض ضمناً پان کا ذکر آجانے پر پان کی خصوصیات کا شرح و بسط کے ساتھ بیان کرنا۔

لیکن باوجود اس عیب کے شاعر نے نہ اصل موضوع سے علیحدگی اختیار کی ہے نہ اس سے تسلسل میں کسی قسم کا فرق آنے دیا ہے۔

سیرت نگاری سیرت نگاری ایک مشکل فن ہے ملک محمد جائسی نے بھی اس فن کی مشق کی ہے لیکن وہ انسانی فطرت کے اُلجھاؤ میں نہیں پڑے اُنھوں نے ہر فرد کو تصوف کی ایک نہ ایک اصطلاح کا مترادف قرار دیا ہے اور اس لحاظ سے اپنے افراد نظم کی محض ایک خصوصیت کو نمایاں کیا ہے۔ کسی کی بہادری کا ذکر کیا ہے تو کسی کی محبت کا۔ کسی کی وفا کو معرض تحریر میں لائے ہیں تو کسی کی دغا کو غالباً یہی وجہ ہے کہ ملک صاحب کے یہاں سیرت نگاری کے جو مرقعے ملتے ہیں وہ سادے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے شاعر نے نہ اپنے اصول موضوع سے علیحدگی اختیار کی ہے نہ تسلسل میں کسی قسم کا فرق آنے دیا ہے۔

پدماوتی پدماوتی نظم کی روح رواں ہے۔ ابتدائے نظم سے آخر تک کسی نہ کسی عنوان سے اس کا ذکر کتاب میں موجود ہے۔ خود نظم کا نام بھی اسی کے نام پر پدماوت رکھا گیا ہے۔ دراصل نظم کی تمام خوبیاں اُسی کی ذات کی رہین منت ہیں۔ اُس کی سیرت میں ایک خاص قسم کی متانت اور سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ چتّور آنے سے قبل وہ صرف ایک سچّی محبت کرنے والی عورت کے لباس میں نظر آتی ہے رتن سین کو خوش پاتی ہے تو خود بھی شاداں نظر آتی ہے جب وہ غمگین ہوتا ہے تو یہ بھی خاک بسر ہو جاتی ہے۔ رتن سین کو سُولی کا حکم ہوتا ہے تو پدماوتی بھی جان پر کھیلنے کو تیار ہو جاتی ہے۔

اُس کی رہائی ہوتی ہی تو یہ بھی خنداں دکھائی دیتی ہی — شوہر پرستی پدماوتی کی سیرت کی جان ہی اور اس کے کردار کا کوئی گوشہ اس صفت سے خالی نہ ملے گا۔

پدماوتی محبت کا ایک بے مثل مجسمہ اور فراست کا ایک قابلِ تقلید نمونہ ہی۔ شاعر جائسی نے اس کی سیرت کو فراست کا مترادف قرار دیا ہی۔ لیکن دراصل اس کے خاص جوہر محبت اور وفاداری بشرط استواری ہیں اور اہلِ دل کے نزدیک یہی "عین ایمان" ہی۔

رتن سین

ملک محمد جائسی نے رتن سین کو روح قرار دیا ہی اور چتوّر کو جسم۔ دراصل رتن سین نظم کی جان ہی۔ اور راجپوتوں کی ہنگامہ آرائی کے ساتھ اُس کو وہی نسبت ہی جو جان کو جسم کے ساتھ ہوتی ہی۔ اس کی موجودگی میں چتوّر آباد اور خوش حال ہی اور جب وہ نہیں تو چتوّر سُونا معلوم ہوتا ہی۔ اِدھر رتن سین مارا گیا اُدھر چتوّر قالب بے جان کی طرح بے حس نظر آنے لگا۔ پدماوتی کے بعد اگر کوئی فرد نظم پر حاوی معلوم ہوتا ہی تو وہ ذات رتن سین کی ہی۔ رتن سین کی پیشانی سے جواہر کی سی روشنی ظاہر تھی۔ اور بادشاہوں کی شان و شوکت اُس میں موجود تھی — سیر و شکار کا شوق، عجائبات عالم کا مطالعہ کرنے اور حتی المقدور اُن کو فراہم کرنے اور جمع کرنے کا ذوق یہ سب اُس میں موجود تھا اور اسی ذوقِ سلیم کا نتیجہ تھا کہ ہیرامن کے نطق و گویائی نے رتن سین کو گرویدہ کرلیا۔

رتن سین کی محبت پاک تھی اور اُس کا عشق سچا لیکن باوجود حد درجہ محبت کرنے کے وہ خوددار بھی ہی۔ چنانچہ سہاگ کی رات کو جب

پدمنی راجہ کا امتحان لیا چاہتی ہو تو وہ کہتا ہو کہ

"ہون دن پر جھکی تم چھانہاں"

ترجمہ} مَیں سورج ہوں اور تم اُس کا عکس۔

رتن سین کا علاؤالدین کو قلعے میں بلانے کے سلسلے میں اپنے دو معتمد سپاہیوں یعنی گورا اور بادل کی ناراضگی کا خیال نہ کرنا اس کی سادہ لوحی پر دال ہی۔ لیکن ایک محبِ صادق ہونے کے اعتبار سے ہم اس بارے میں اُس کو معذور سمجھ کر معاف کر سکتے ہیں۔ راہ عشق میں اُس کی پامردی اس کی کمزوریوں کی پردہ پوش ہی۔ غالباً چتّور اور خلق اللہ کو تباہی سے بچانے کے لیے اس نے ایسا کیا۔

ناگمتی ناگمتی کو شاعر جائسی نے دنیا کا دھندا کہا ہی۔ اور جو سیرت اُس کی نظم میں پیش کی گئی ہی وہ بھی ایسی ہی جیسی ایک دنیادار کی ہوتی ہی۔ عورت ہونے کی حیثیت سے اُس میں اور پدماوتی میں اکثر باتیں مشترک ہیں وہ بھی اپنے سرتاج کی جدائی میں افسردہ اور اُس کے قید ہو جانے کی وجہ سے پریشان ہوتی ہی اور غالباً اتنی ہی جتنی کہ پدماوتی لیکن قید سے رہا کرنے کی تدبیر پدماوتی ہی سوچتی ہی۔ پدماوتی کا عشق عقل کے ساتھ جلوے دکھاتا ہی اور ناگمتی کا عشق اندھا ہی۔

اولاً ناگمتی ایک برخود غلط عورت کی صورت میں نظر آتی ہی جس کو اپنے حسن نیم روز پر پایندگی کا گمان ہی اور جس کی خود پسندی اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ وہ توتے تک سے داد کی طالب تھی۔ اللہ رے حسن دل فریب کی ابلہ فریبیاں!!

لیکن یہ تمام خود آرائی اور خود پسندی رتن سین کی چاہت تک موقوف ہے۔ ادھر رتن سین کی نظر پھری اُدھر ساری خود نمائی اور سنگار غایب ہو جاتا ہے۔ رتن سین کے جوگی بن کر جنگل کی راہ لینے پر ناگمتی کی برہا کوک جو بارہ ماسے کی شکل میں پدماوت میں موجود ہے یا رتن سین کے قید ہو جانے پر ناگمتی کی پریشان حالی ناگمتی کی محبت کا اُسی طرح پتہ دیتی ہے جس طرح رتن سین کی واپسی پر اس کا پھولا نہ سمانا ـــــ ناگمتی کی سیرت ہندی عورتوں کی پایدار اور بے لوث محبت کا ایک کمیاب نمونہ ہے۔

رتن سین اور بادل کی مائیں

یہ افراد نظم بظاہر تو دو ہیں لیکن بحیثیت ماں کے ان دونوں میں اولاد کی محبت اور ماں کی ممتا مشترک ہیں۔ رتن سین کی ماں اُس کے سنہل گڑھ کا رُخ کرتے وقت بے حال نظر آتی ہے اور بادل کی ماں باوجود اس کے کہ تلواروں کی چھاؤں میں پلی ہے بادل کو میدان جنگ کی طرف جانے سے روکتی ہے۔ بچوں کی جُدائی دونوں کو شاق ہے۔

بادل کی بیوی

یہ سیرت تمام نظم میں سب سے زیادہ مؤثر اور دل گداز ہے بادل کی بیوی ابھی ابھی بیاہ کر آئی ہے چنانچہ اُس میں شوہر کو میدان جنگ سے باز رکھنے کا فطری جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ لیکن اس کی سیرت میں ایک چھتری ہوشمند عورت کی نمایاں خصوصیات بھی موجود ہیں۔ چنانچہ اپنے شوہر کے میدان سے مُنہ موڑنے کو تمام قوم اور قبیلے کے لیے باعث ننگ

سمجھ کر وہ خود بادل کو جنگ کے لیے آمادہ کرتی ہے۔ اور اس طرح جوش دلاتی ہے۔

جو تم کنت جوجھ جیو کاندھا تم کئے ساہس میں ست باندھا
رن سنگرام جوجھ جت آؤ لاج ہوئے جو پیٹھ دکھاؤ

ترجمہ} یعنی اے پیارے شوہر تم لڑائی کا ارادہ رکھتے ہو اور ہیں ستی ہونے کا، ان دونوں باتوں کا جب دونوں طرف سے نباہ ہوگا تب ہی ہم پھر مل سکیں گے۔ اگر تم لڑائی میں مارے گئے اور ہیں ستی نہ ہوئی یا تم پیٹھ دکھا کر بھاگ آئے تو ان صورتوں میں ہم میں ملاقات نہ ہوگی۔ دونوں نے اپنے اپنے ارادوں کو پورا کیا تو ضرور ساتھ ہوگا جیت کر آئے تو دنیا میں اور مارے گئے تو آخرت میں۔

راگھو یہ ایک پست فطرت فرد ہے۔ جس میں لالچ ملک فروشی، بے حیائی اور ہوس کوشی کے نقوش ابھرے ہوئے ملتے ہیں۔

راگھو فی الواقع جیسا کہ ملک محمد جائسی نے لکھا ہے شیطان ہی تھا۔

گورا اور بادل یہ دونوں باپ بیٹے راگھو چیتن کی ضد ہیں اور دنیائے شجاعت کے دو انمول موتی، ملک دلیری اور خوش فکری کے دو درخشاں ستارے اور محبِ وطن سے ایسے سرشار کہ کسی قسم کا بُرے سے بُرا برتاؤ بھی ان کو ملک فروشی کے لیے آمادہ نہ کر سکتا تھا۔ ملک کی حفاظت کے مقابلے میں ان کو کوئی

لے

जौ तुम कंत जूझ जिउ काँधा, तुम किय साहस मैं सत बाँधा ।
रन संग्राम जूझि जिति आवहु, लाज होइ जौ पीठि देखावहु ॥

(पदमावत)

چیز عزیز نہ تھی۔ شرافت کو اُن سے شرف حاصل تھا اور وفاداری کو اُن پر ناز۔

علاء الدین یہ فرد نظم اپنے ارادوں میں استقلال کا اظہار کرتا ہے اور ایک ایسے سپاہی کے لباس میں دکھایا گیا ہے جس کو غرور دولت اور ہوس کوشی نے اندھا کر دیا ہو۔

وصف نگاری پدماوت میں وصف نگاری کی اکثر مثالیں شادی کے تذکرے اور سنہل دیپ کے سفر اور دیگر مقامات پر ملتی ہیں لیکن شاعر جائسی کی وصف نگاری کو کامیاب وصف نگاری نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے کہ ملک محمد جائسی نے محض چیزوں کے نام گنوا دیے ہیں اور یہ کسی طرح بھی وصف نگاری کی تعریف میں نہیں آتا مثلاً سنہل دیپ کا جو تذکرہ اُنھوں نے کیا ہے اُس میں محض نام گنوا دیے ہیں اور یہ کہہ دیا ہے کہ وہاں جانا گویا "کیلاس" جانا ہے لیکن اس کے سوا اُن کے بیان میں کچھ نہیں ہے۔ نہ تو شیرینی روح پائی جاتی ہے اور نہ کوئی رونق۔

بازار میں زر و جواہر کی دُکانیں لگی ہوئی ہیں۔ ترازو کی ڈنڈیاں چاندی کی ہیں۔ سوداگر بھی دُکان پر بیٹھا ہوا ہے لیکن پھر بھی بازار میں سناٹا ہے۔ نہ بِکری ہو رہی ہے نہ خریدار دکھائی دیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دُکان دار اونگھ رہا ہے اور خریدار سو گئے ہیں۔ ٹھگ، اُچکے، گرہ کٹ سبھی اس بازار میں موجود ہیں مگر ہم ایک کو بھی نہیں پہچانتے نہ ملک صاحب ان کا کوئی حلیہ بتاتے ہیں۔ طوائفیں بھی بہ ہزار عشوہ و ناز موجود ہیں مگر اُن کی موجودگی بھی بازار میں کوئی

خصوصیت نہیں پیدا کرتی ۔ اُن کے ہوتے ہوئے بھی سرفروش کہیں نظر نہیں آتے۔

اس قسم کی وصف نگاری سرور کی واقعہ نگاری سے ملتی جُلتی ہے جو بے کیفیت ہوتی ہے۔ نہ کہ سرشار کے انداز بیان سے جس میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔

رسم ورواج

ہندستان کی عورتوں کے مشاغل سیر و تفریح اور اُن کی آزادی پر کب سے پہرے بٹھا دیے گئے اور دنیا کی اکثر آسائشیں اُن کے لیے کب سے ممنوع قرار دے دی گئیں۔ اس کی صحیح تاریخ بتانا مشکل ہے۔ البتہ ہندستان کے تمدن اور معاشرت پر نظر ڈال کر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہاں عورتوں کو کافی آزادی تھی۔ میلے اور اس قسم کے اکثر اجتماعی موقعے عورتوں کے آپس میں ملنے جلنے اور مبادلۂ خیالات کے لیے خاص طور پر وقف تھے اور اب بھی اس معاشرت کے رہے سہے جلوے کبھی کبھی نظر آ جاتے ہیں۔

بسنت، ہولی، دیوالی کے تہوار ہندی عورتوں ہی کی بدولت آج بھی کیسے پُر رونق اور دلفریب ہوتے ہیں۔ ساون میں جھولے کی پینگیں برسات کی دلچسپیوں میں اور بھی اضافہ کر دیتی ہیں۔ چنانچہ ملک صاحب کے زمانے میں ان مواقع کے علاوہ عورتوں کے آپس میں ربط و ضبط کا ایک اور مظاہرہ "جل کھیڑا" تھا۔ یعنی عورتیں گروہ در گروہ نہانے کو جاتی تھیں اور اس سلسلے میں تالابوں اور دریاؤں پر جلسے جمایا کرتی تھیں۔ پدماوت میں اس رواج کا تذکرہ پدمنی کے غسل کے سلسلے میں اس طرح کیا گیا ہے کہ محاکات اور واقعہ نگاری کی خوبیوں کے

علاوہ اوصاف شاعری اور محاسن زبان بھی اس میں پائے جاتے ہیں۔

پدماوت کا سہیلیوں کی جھرمٹ میں غسل کے لیے جانا، تالاب کے نزدیک پہنچنا، ساریاں چُن کر رکھ دینا اور پھر تالاب کے اندر داخل ہو کر بال کھول دینا اور مستانہ وار کھیلنا، ان سب باتوں کا ذکر، تشبیہہ اور استعاروں کی جن حسن افزا نزاکتوں کے ساتھ کیا گیا ہے وہ تعریف سے مستغنی ہے۔

فنّی خصوصیات فنّی اعتبار سے بھی پدماوت ایک گرانمایہ تصنیف ہے۔ شگفتہ استعارے عام اور مقامی تشبیہات، مناظر قدرت کی مصوری، دردِ غم کی دل گداز تصویریں، حسن و عشق کی نیرنگیاں غرض اکثر فنّی خصوصیات پدماوت میں پائی جاتی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

تشبیہہ پدماوتی اپنی سہیلیوں کے ساتھ تالاب میں غسل کر رہی ہے اس منظر کی کیسی حسین تصویر کھینچی گئی ہے۔

۱۔ سرور تنہہ سمائے سنسارا[1] چاند نہائے پیٹھ لے تارا

ترجمہ} تالاب میں ایک عالم سمایا ہوا ہے۔ چاند ستاروں سمیت نہا رہا ہے۔

۲۔ جس آنچل منہہ چھپے نہ دیا[2] تس انجیار دکھاوے ہیا

ترجمہ} جس طرح آنچل میں چراغ کی روشنی نہیں چھپتی اُسی طرح دل کا

---

[1] सरवर मंह समाय संसारा
चान्द नहाय पीठ ले तारा

[2] जस लाँचल मँह छिपै न दिया
तस उजियार दिखावै हिया

نور ضو فگن رہتا ہے۔

۳۔ ناسک کیر، کنول مکھ سوہا[1] پدمن روپ دیکھ جگ موہا

ترجمہ} توتے کی سی ناک اور کنول کا سا زیبا مُنہ، پدمنی کی صورت دیکھ کر عالم فریفتہ ہوا۔ سمندر کا پانی گرم ہو کر موجیں مار رہا ہے اس کی تشبیہہ تکمل دی ہے ملاحظہ ہو:۔

۴۔ تلپھے[2] تیل کراہ جم ام تلپھے سب نیر

ترجمہ} جس طرح کڑاہ میں تیل جوش مارتا ہے اسی طرح پانی اُبل رہا ہے۔ رتن سین پدماوتی کی سہیلیوں سے کچھ کلام کرتا ہے اس پر وہ سب کی سب ہنستی ہیں۔ اُس کی تشبیہہ یوں دی ہے:۔

۵۔ جانو[3] رین ترائن پرگسی

ترجمہ} گویا رات میں ستارے نمودار ہوئے۔

حُسن تعلیل توتے کی گردن میں سُرخ و سیاہ حلقہ ہوتا ہے شاعر جائسی اس کی علت یہ بتاتے ہیں کہ نامۂ ہجر جو اس کے گلے میں باندھ دیا گیا تھا اُسی کی تپش سے نشان پڑ گئے۔ ملاحظہ ہو:۔

۱۔ راتے[4] سیام، کنٹھ جر لاگے

ترجمہ} سُرخ و سیاہ کنٹھ جلنے کی وجہ سے پڑ گیا تھا۔

---

[1] नासक कीर कन्वल मुख सोहा
पदमन रूप देख जग मोहा

[2] तलफै तलफै कराह जिम इम तेल सब नीर

[3] जानौ रैग तरायन परगसी

[4] राते स्याम कंठ जर लागे !

چاند اخیر ماہ میں دو دن غایب ہو جاتا ہی اور پھر جب دوسرے مہینے کی پہلی تاریخ شروع ہوتی ہی تو وہ سیاہی مایل ہو جاتا ہی اس کی وجہ وہ پدماوت کے حُسن کو دیکھ کر شرمندہ ہو جانا بتاتے ہیں (غالب نے بھی اسی طرح کی علت اپنے اس قصیدے میں بتائی ہی جس کا مطلع ہی "ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام") شاعر جائسی فرماتے ہیں:-

۲- اتی روپ مورت پرگئی ؎۱ گھٹ گھٹ چندر اماوس بھئی

ترجمہ} ایسی حسین عورت ظاہر ہوئی کہ چودھویں رات کا چاند چھوٹا (خفیف) ہو کر گھٹ گیا۔ گھٹتے گھٹتے اماوس ہوا اور شرم کی وجہ سے دو دن زمین میں گڑا رہا پھر جب دوج کے دن نکلا تو سیاہ فام تھا۔ یہ سیاہی اسی کے چہرے پر رشک کی ہی۔

مبالغہ پدماوتی کی مانگ کو شاعر جائسی نے کرن سے تشبیہہ دی ہی پھر غالباً اس تشبیہہ کو کم وقعت سمجھ کر فرماتے ہیں۔ سورج کی روشنی کم اور اس کی زیادہ۔

۱- جانو سورج ؎۲ کرن ہت کاڑھی سورج کلا گھاٹ وہ باڑھی

غالب نے بھی خوب کہا ہی:-

حُسن مہ گرچہ بہ ہنگام کمال اچھا ہی
اس سے میرا مہ خورشید جمال اچھا ہی

ؔ۱
इती रूप मूरति परगाइ ।
घट घटचन्द्रअमावस भई ॥

ؔ۲
जानो सूरज किरन हित काढ़ी
सूरज कला घाट वह वाढ़ी

تخیل اور روانی تخیل اور روانی شاعری کی جان ہیں جس نظم میں ان میں سے ایک بھی موجود ہو کافی بلند سمجھی جاسکتی ہی۔ چہ جائیکہ وہ نظم جس میں یہ دونوں اوصاف موجود ہیں جیسا کہ پدماوت میں ہی روانی تو اس درجہ ہی کہ اکثر ابیاتِ منظوم روزمرہ معلوم ہوتی ہیں۔

(الف) **روانی**۔ کسی سے ملاقات کے لیے اگر چتّوڑ جائیں تو کہیں گے کہ تم کو چتّوڑ میں سُن کر میں نے کہا کہ ملاقات کروں۔ بالکل اسی طرح ملک محمد جائسی نے نظم میں کہا ہی۔

۱۔ سنے تم کہنہ چتّور منہ کہیں کہ بھینٹوں جاے

اسی روانی کے ساتھ دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

بل۲ جیو نہ رہا تن سو جاگا

ترجمہ} جان میں دم نہ رہا (مگر) جسم میں تو زور ہی۔

غالبؔ نے بھی اسی مضمون کو دوسرے انداز سے کہا ہی۔

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہی
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

جائے۳ نہ میٹا تاکر کہا

ترجمہ} اُس کا کہا ٹل نہیں سکتا۔

۱؎ सुनि तुम कँह चित्तौर मँह, कहिएँ कि भेंटों जाए

۲؎ बल जिये न रहा तन सो जागा।

۳؎ जाय न मेटा ताकर कहा।

ایک[1] بار بھر دیو پیالہ بار بار کو مانگ

ترجمہ} ایک ہی بار پیالہ بھر دو بار بار کون مانگے۔

مانیؔ جائسی نے اس مضمون کو ذرا بلند کر کے یوں پیش کیا ہے۔

اندازہ ترا کیا ہے وہ کیا جانیئے کیا دے

رکھ ظرف تمنا یونہی اس در پہ صدا دے

روان کے لمحات آخر کی بے کسی کس بے ساختگی کے ساتھ بیان کی ہے۔

۵۔ ناتی پوت کوٹ دس اہا[2] روون ہار نہ ایکو رہا

ترجمہ} وہ راون جس کے دس کروڑ پوتے اور نواسے تھے اُس کا رونے والا کوئی نہ تھا۔

آرزوؔ لکھنوی نے بھی اسی مضمون کو کہا ہے:-

قتال جہاں معشوق جو تھے سوتے ہیں پڑے مرقد اُن کے

یا مرنے والے لاکھوں تھے یا رونے والا کوئی نہیں

۶۔ رکت[3] کے بوند کیا جب آہیں پدماوت پدماوت کاہیں

ترجمہ} جب تک جسم میں لہو کی ایک بوند بھی ہے اس وقت تک پدماوت پدماوت رٹتے جاؤں گا۔

فارسی میں خسرو دہلوی کا ایک شعر بہت مشہور ہے جس کا ایک مصرع ۔" من تو شدم تو من شدی" زبان زد عام ہے۔ اسی مضمون کو

۱؎ एक बार भर देवपियाला, बारबारकोमांगु

۲؎ नाती पूत कोटि दस अहा । रोवनहार न एको रहा ॥

۳؎ रकत के बूँद किया जब आही।

पदमावत पदमावत काही

شاعر جائسی نے بھی باندھا ہے۔

۷۔ جیو کاڑھ لین تہ اَئیں وہ بھا گیا جیو تم بھئین ۱؎

ترجمہ} جان نکال کر تم چھپ گئیں وہ جسم ہو گیا اور تم جان

۸۔ برہ کال مارے پر مارے ۲؎

ترجمہ} ہجر ضرب پر ضرب لگاتا ہے۔ مرے کو مارتا ہے۔ معشوق کی طلب پر سر کے بل جانے کو کس انداز کے ساتھ نظم کیا ہے ملاحظہ ہو:۔

۹۔ جو بلاوے پا سوں ۳؎ ہم تہاں چلیں بلاٹ

ترجمہ} جو وہ پانو کے بل بلاوے تو ہم سر کے بل جائیں۔

مکتوب نصف ملاقات کا حکم رکھتا ہے اسی کو شاعر جائسی نے بھی نظم کیا ہے۔

۱۰۔ آدھی بھینٹ پریتم پاتی ۴؎

۱۱۔ آپنہہ گرو اور آپنہہ چیلا ۵؎ آپنہہ سب او آپ اکیلا

ترجمہ} آپ ہی پیر اور آپ ہی مرید آپ ہی سب کچھ اور آپ ہی اکیلا۔

جب بچھڑا ملتا ہے تو اس سے محبت زیادہ ہوتی ہے اسی مضمون

۱؎ जिय काढ़ लीनतै अहीं – वह भा किया जीव तुम भई

۲؎ बिरह काल मारे पर मारे

۳؎ जो बुलावे पासों हम तहां चले लिलाट।

۴؎ आधी भेंट प्रीतम पाती

۵؎ بقیہ ہندی حاشیہ صـ۱۵۲

کو یوں نظم کیا ہے۔

۱۲۔ ادھک موہ جو ملے بچھوئی[۱]

۱۳۔ جیو لیت پونچھ نا کالو[۲]

ترجمہ} موت دن میں پوچھتی اور انتظار نہیں کرتی۔

ایک منظر پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

اور نکھت چھوندس اجیارے بٹانوں بٹانوں دیب اس بارے

ترجمہ} اور ستارے چاروں طرف روشن تھے۔ جگہ جگہ مثل چراغ کے جل رہے تھے۔

۱۵۔ ٹوٹے[۳] من نو موتی پھوٹے من دس کانچ

لینھ سمیٹ سب آبھرن ہوئے گا دکھ کرناچ

ترجمہ} غم میں نو من موتی اور دس من کانچ چور چور کر دی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد سب نے ٹکڑوں کو سمیٹ لیا گویا دُکھ کا ناچ ختم ہوگیا۔

(ب) تخیّل۔ یہ بتانا کہ یہ مثال روانی کی ہے اور اس میں خالص تخیّل ہی بہت دشوار ہے اس لیے کہ تخیل اور روانی کو بعض اوقات

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۱ سے آपहि गुरु रुअ आपहि चेला।

आपहि सब अरु आप पकेला॥

[۱] अधिक मोह लिविद्वीशी।

[۲] जिब लत पूछ ना कालू।

[۳] टूट मन नौ मोती, फूटे मन दस कांच।

लीन समेट सब आभरनु होयगा दुख कर नांच॥

علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہی کہ کہیں تخیل کا پہلو زیادہ روشن ہو اور کسی جگہ بے ساختگی اور روانی کا۔ چنانچہ اب تک جو مثالیں اس عنوان کے تحت میں پیش کی جاچکی ہیں ان میں روانی زیادہ تھی اور تخیل کا حصہ کم تھا۔ اب جو مثالیں دی جائیں گی اُن میں روانی کی بہ نسبت تخیل زیادہ پایا جاتا ہی ملاحظہ ہو:۔

عشق پہلے آسان معلوم ہوتا ہی لیکن بعد میں اُس کا نباہ دشوار ہو جاتا ہی۔ اسی مضمون کو حافظ نے بھی کہا ہی اور اسی کو ملک محمد جائسی نے بھی باندھا ہی۔

۱۔ پن جھوئے[۱] کٹھن بناہت اورا

غرور انسان کو مُنہ کے بل گرا دیتا ہی اسی کو تخیل کے ساتھ یوں ادا کیا ہی۔

۲۔ ٹوٹ[۲] ہنڈول گرب جیہہ جھوے

ترجمہ} غرور کا ہنڈولا جس میں جھولتا تھا ٹوٹ گیا۔ عاشق کو وصال نہ ہونے تک تکلیف ہی جب دوست ملا سارا غم غلط ہو جاتا ہی اسے اس طرح نظم کیا ہی۔

۳۔ تو لگ[۳] دکھ پیتم نہ بھیٹا   ملے تو جائے جنم دکھ میٹا

ترجمہ} محبت اندھی ہوتی ہی عقل سے اُسے سروکار نہیں۔ ملک صاحب نے اس مضمون کو ایک خاص طرز سے ادا فرمایا ہی۔

---

[۱] पुनि होय कठिन निबाहत ओरा ।

[۲] टूट हिंडोल गरव जेहि झूले ।

[۳] तौ लगी दुख प्रीतम नहिं भेटा ।

मिले तो जाय जनम दुख मेटा ।

۴- پریم[۱] پنتھ دن گھڑی نہ دیکھا تب دیکھے جب ہوئے سریکھا

ترجمہ} محبت میں دن اور گھڑی نہیں دیکھتے جب عقل باقی ہو تو اُس کا خیال رہے۔ زمانہ ہر شخص کو پیس دیتا ہی اس خیال کو شاعر جائسی نے استعارے کی مدد سے ادا کیا ہی۔ فرماتے ہیں۔

دھرتی[۲] سرگ جانت ے دوؤ - یہ بچ جیو رکھ بچانہ کوؤ

ترجمہ} زمین اور آسمان مثل چکّی کے دو پاٹ کے ہیں جس نے اس میں سر رکھا سلامت نہ بچا۔ بعد میں کبیر نے بھی اسی خیال کو نظم کیا ہی۔

محاکات پدماوتی تالاب میں غسل کر رہی ہی اس کی جو تصویر شاعر جائسی نے پیش کی ہی اُس سے بہتر غالباً عکس سے بھی نہیں اُتاری جاسکتی۔

سرور[۳] نیر پدمنی آئی گھو پنا چھوڑ کیس پھیلائی
سس مکھ انگ ملیاگر باسا ناگن چھاپ لینہ چہُو پاسا

ترجمہ} تالاب کے نزدیک پہنچ کر پدمنی نے گھونگھٹ اُٹھا کر بال بکھرا دیے۔ چاند ایسے چہرے اور خوشبو سے بسے ہوئے بدن کو کالی ناگنوں نے گھیر لیا۔

---

[۱] प्रेम पंथ दिन घड़ी न देखा,
तब देखे जब होय सरेखा ॥

[۲] धरती सरग जांत ले दोऊ। यह विच जिव रख बचान कोऊ ॥

[۳] सरवर नियर पदमनी आई वोंपा छोड केस पैलाई।
ससि मुख अंग सलया कर बासा नागन छाप वीह चहु पासा।

محاورہ پدماوت میں اکثر محاورے استعمال ہوتے ہیں جن میں سے چند درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ کر بسنت[۱] پدماوت گئی راجا تب بسنت سدھ بھئی

ترجمہ } جب بسنت کرکے پدماوت چلی گئی تب راجہ کو بسنت کی خبر ہوئی۔

۲۔ جو پیسیت[۲] گھن جائے پیسا

ترجمہ } جو کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہی۔

مقولہ شاعر جائسی نے بعض بعض مقاموں پر مقولے نہایت خوبصورتی سے نظم فرمائے ہیں۔

باور[۳] اندھ پریت کر لاگو سونہ دھسے نہیں سوجھے آگو

ترجمہ } جس کو محبت ہوتی ہی وہ دیوانہ اور اندھا ہو جاتا ہی۔ سامنے چلا جاتا ہی مگر سوجھتا نہیں۔

ضرب المثل مثل محاوروں کے ضرب الامثال بھی پدماوت میں موجود ہیں اور جس روانی کے ساتھ وہ نظم کیے گئے ہیں ان سے ان کا حسن دوبالا ہو جاتا ہی۔

کنچن[۴] برن سُوا اتِ لونا مانو ملا سہاگن سونا

ترجمہ } سونے کے رنگ کا حسین توتا تھا گویا سونے میں سہاگا ملا

---

۱ कै वसंत पद्मावत गई । राजा तव वसंत सुधि भइ

۲ जौ पीसत घुन जाये पीसा ।

۳ बाउर ग्रंध प्रीत कर लागू ।
सोन धसे नहिं सूझे ग्राग ॥

۴ कंचन वरन सुग्रा ग्रति लोना । माना मिला सहागन सोना ॥

۲- سوا[۱] کا بول منو بکھ لاگا

ترجمہ} توتے کی بولی زہر لگی۔

۳- کاہ[۲] وہ پنکھ ٹوٹ منہ کوٹے اس بڑ بول چت مکھ چھوٹے

ترجمہ} کیا وہ پرند جس کے مُنہ سے تلخ بات نکلے وہی مثل کہ چھوٹا مُنہ بڑی بات۔

۴- ماتھے نہیں[۳] بسیارئے جون سٹھ سوا سلون
کان ٹوٹیں جیہی پہر کالے کرب سوسون

ترجمہ} سر نہ چڑھانا چاہیے چاہے توتا کتنا خوبصورت کیوں نہ ہو۔ کان ٹوٹیں جس زیور سے ایسا سونا[۴] کس کام کا۔

حکمت و موعظت

پدماوت میں پند و نصائح اور حکمت کے بہت سے مسایل بیان ہوئے ہیں۔

بہت کیا پدماوت شروع سے آخر تک تمام تر حکمت اور سرتا پا پند ہی ہی۔ لیکن انداز بیان واعظانہ نہیں ہی بلکہ گفتگو کا رنگ لیے ہوئے ہی۔

ملک صاحب کا یہ انداز بیان بالکل اچھوتا ہی جو سحر کا حکم

---

۱ सुआ का बोल मनो विष लागा

۲ काह वह पंख टूट मुँह कोटे।
अस बड़ बोल चित्त मुख छोटे॥

۳ माथे नहीं बिसारिये जौं सुठि सुआ सलोन।
कान टूटे जेहि पहर, काले करब सोसोन॥

۴ مثل مشہور ہی کہ بھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔

رکھتا ہی۔ ورنہ کجا مسایل تصوّف اور کجا ان کی عام فہمی۔
آستانۂ محبّت کا احترام کرنے اور وہاں پر غصّہ نہ کرنے کی تعلیم ایسے الفاظ میں دی گئی ہی کہ انسان بغیر سبق لیے نہیں رہ سکتا۔ فرماتے ہیں:۔

اپریم بار ہوئے کرود۔ نہ ہوؤ[۱]

ترجمہ} درِ دوست پر غصّہ نہ کرنا چاہیے۔
سچ کی تعلیم کس عمدہ پیرائے میں اور کن کن انداز سے دی گئی ہی۔

۲۔ جہاں ست تہان دھرم سنگھاتا[۲]

ترجمہ} جہاں سچ ہی وہیں ایمان بھی ہی۔
اس فلسفے کو ملک صاحب نے مختلف عنوان سے بیان فرمایا ہی۔

۳۔ پرکھ چاہئے اونچ ہیاؤ[۳] دن دن اونچے راکھے پاؤ

ترجمہ} انسان کو بلند حوصلہ ہونا چاہیے اس کو لازم ہی کہ روز بروز بلندی پر قدم رکھے۔

۴۔ دن دن[۴] اونچا ہووے جنھ اونچے پر جاؤ
اونچ چڑھت جوکہن پڑے اونچ نچھاڑے کوؤ

---

[۱] प्रेम वार होय क्रोध न होऊ।

[۲] जहां सत्य तहं धरम संघाता

[۳] पुरुष चहिये ऊच्च हियाऊ।
दिन दिन ऊंचे राखे पाऊ॥

[۴] दिन दिन ऊंचा होवे जेहि ऊंचे पर जाव
ऊंच चढ़त जेहि खिस पड़े, ऊंच न छोड़े कोव॥

ترجمہ} جو شخص اونچے سے ملاقات رکھے دن دن ترقی کرے گا. اگر اونچے سے گرے بھی تب بھی بلندی کا خیال نہ چھوڑے

دل کا حال اور معشوق کی چاہ چھپائے سے نہیں چھپتی. راہِ عشق کی مصیبتیں پتّھر کو پانی کر دیتی ہیں ان دونوں مصیبتوں کا ذکر شاعر جائسی نے کیا ہی۔

۵۔ دوئی سو چھپائے نا چھپے ایک ہیا اک پاپ [ا]

۶۔ پریم پنتھ [۲] من بھول نہ راجا   کٹھن پریم سر دئے تو چھاجا

ترجمہ} راہ محبّت کی کہانی سُن کر ناراض نہ ہو. محبّت کی راہ بہت سخت ہی بغیر سر دئے کچھ بن نہیں پڑتا۔

شوہر کی اطاعت ہندی عورت کا امتیاز ہی اور غالبًا اس کی اطاعت شعاری ہی اس کا سبب ہی کہ باوجود تمام تمدّنی اور معاشری پابندیوں کے ہندی عورت اکثر اپنے شوہر کے دل پر پورا پورا قابو رکھتی ہی اسی کو ملک صاحب نے کہا ہی۔

۷۔ کنت [۳] سہاگ پائے سا دھا

پاوے سوئی جو اُوہی چت باندھا

ترجمہ} شوہر کے سہاگ کا مزہ وہ پاتا ہی جو اسی کا دھیان رکھے.

[ا] दो सो छिपाये ना छिपे, एक हिया एक पाप

[۲] प्रेम पंथ मन भूल न राजा।
कठिन प्रेम सर दिये तो छाजा॥

[۳] कंत सोहागा पाय साधा।
पावे सोई जो वहिचित बाधा॥

۸۔ لونؔ بلون تہاں کو کہے[1] لون وہی کنت جے چہے

ترجمہ} حسین اور غیر حسین کا کیا سوال۔ جسے شوہر چاہے وہی حسین ہے۔
بقول مانی جائسی ع۔ "جس ذرّے کو آغوش میں لے لے وہ حسین ہے"۔

۹۔ عاقبت نااندیشی سے یہ کہ کر باز رکھا ہے۔

دوش تاہ جیہہ سوجھ نہ آگو[2]

ترجمہ} جس کو آگے نہ سوجھے وہی قابل الزام ہے۔

ہنر کو نہ تو پوشیدہ رکھنا چاہیے اور نہ اُس کا اس طرح اظہار کرنا چاہیے کہ خود ستائی معلوم ہونے لگے ان میں سے ایک اصول کی تلقین ملک صاحب نے بھی کی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

۱۰۔ گن نہ چھپائے پردے ماہا[3]

ترجمہ} ہنر کو پوشیدہ نہ رکھنا چاہیے۔

جب قحط الرّجال ہوتا ہے تو ناقص چیز بھی کامل ہو جاتی ہے۔

جیہہ سرور ما ہنس نہ آوا[4] بگلا تہہ سر ہنس کہاوا

ترجمہ} جس تالاب میں ہنس نہیں آتے وہاں بگلا ہی ہنس کہلاتا ہے۔

ان مثالوں سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ملک صاحب نے پند و نصایح میں عمد کے پہلو کو قطعاً نظر انداز کر دیا ہے۔ روزمرہ اور ان کی زبان کی

---

[1] लोन विलोन तहां को कहे ।
लोन वही कंत जो चहे ॥

[2] दोष ताहि जेहि सूझ न आगू ।

[3] गुन न छिपाय परदे माहा ।

[4] जेहि सरवर मंह हंस न आवा । बगला तेहि सर हंस कहावा ॥

انوکھی اور نرالی شیرینی نے جس پر اُن کو پورا پورا تصرف حاصل تھا اس موضوع کی تلخی کو اور بھی کم کر دیا ہی اس پر ان کا خاص اور دلکش انداز بیان مستزاد ہی۔

اکھراوٹ اکھراوٹ کبیر کی چونیتی کے طرز پر لکھی گئی ہی۔ الفاظ کا انتخاب، زبان کی روانی، بندش کی چُستی پتہ دیتی ہی کہ یہ نظم شاعر جائسی کے دَورِ آخر کا نتیجہ ہی۔ اس کے یہ بھی قرائن ہیں کہ اکھراوٹ پدماوت کے بعد کی تصنیف ہو لیکن سنہ متعین نہیں کیا جا سکتا۔

اکھراوٹ کا نمونۂ کلام

۱۔ میم محمد پریت پیارا — تیں آکھر یہ ارتھ بچارا[1]

۲۔ سا۔ ساہس جا کر جگ پوری — سو پاوا وہ امرت موری[2]

ترجمہ} جو باہمت ہی وہ امرت پاتا ہی

۳۔ کھا۔ کھیلو کھیلو اوہِ بھیٹا — پن کا کھیلو کھیل سمیٹا[3]

ترجمہ} اُس کی معرفت حاصل کرنے والا کھیل کھیلو اور کیا کھیلتے ہو۔

---

[1] मीन मुहम्मद प्रीति पियारा
तिनि आखर यह अरथ बिचारा

[2] सा-साहस जाकर जग पूरी
सो पावा वह अमरत मूरी

[3] खा-खेलहु खलेहु ओहि भैंटा
पुनि का खेलहु, खेल समेटा

۴۔ دے[۱] سب کچھ کرتا کچھ ناہیں جیسے چلے میگھ پر چھاہیں

۵۔ کہوں[۲] سو گیان ککہرا سب آکھر منھ لیکھ
پنڈت پڑھ آکھراوٹی ٹوٹا جوریہو دیکھ

۶۔ جاسو[۳] کیا درپن کے دیکھو آپ ماتھ آپ
آپھ آپو جائے ملو جہن نہ بن نہ پاپ

آخری[۴] کلام نام کے اعتبار سے تو اس کتاب کو ملک صاحب کی آخری تصنیف کہنا چاہیے لیکن اس کے مطالعے کے بعد نظم میں بندش کی سُستی اور زبان کا پھیکا پن دیکھ کر گمان ہوتا ہی کہ اس کتاب کے نام کو تصنیف کی مدت سے کوئی تعلق نہیں ہی۔ بہر حال یہ نظم ابتدائے مشق کی ہو یا آخر زمانے کی ہر صورت میں پدماوت کے قبل ہی کی ہی اس لیے کہ پدماوت میں شیرشاہ[۵] کی

---

[۱] वे सब किछु करता किछु नाहीं।
जसे चलै मेघ परछाईं॥

[۲] कहौं सो ज्ञान ककहरा सब आखर मह लेखि
पंडित पढ़ि अखरावटी टूटा जोरेहु देखि

[۳] जासु कथा दरपन कै देखु आप मँह आप
आपुइ आप जाह मिलु जहँ जहँ नहिं पुन्नि न पाप (पदमावत)

[۴] آخری کلام غالباً آخرت نامہ کی بگڑی ہوئی صورت معلوم ہوتی ہی۔ کتابت کی غلطی سے ایسا ممکن ہی۔

[۵] پدماوت میں شیرشاہ کا ذکر یوں موجود ہی۔
شیرشاہ دلی سلطانو شेर शाह दिल्ली सुलतानू।

مدح ہی اور آخری[1] کلام میں بابر کی، اور پدماوت کا سنہ تصنیف ۹۴۷ھ / ۱۵۴۰ء ہی اور آخری کلام ۹۳۶ھ / ۱۵۲۹ء کی نظم ہی۔

اس میں مرنے کے بعد جو واقعات پیش آئیں گے وہ درج ہیں اور اس سلسلے میں حضرت محمد مصطفےٰ کے اہل بیت کے شفیع روزِ محشر ہونے کا تذکرہ کیا گیا ہی۔

ملک صاحب کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے اعتبار سے یہ کتاب[2] ایک خاص اہمیت رکھتی ہی۔ اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہی کہ محی الدین سے ملک محمد کا سلسلۂ ارادت سیّد اشرف جہانگیر کے گھرانے سے ان کی عقیدت مندی کے بعد شروع ہوا۔

اس نظم میں ملک صاحب کا جائس کو "موراستھان" کے تعارفی فقرے کے ساتھ پیش کرنا اس گمان کو بھی قوی کرتا ہی کہ ملک صاحب نے آخری کلام کو اپنے وطن سے کہیں باہر تصنیف کیا تھا۔ کیونکہ ۹۳۶ھ تک جو اس نظم کی تصنیف کا سنہ ہی سلطنت مغلیہ جائس تک نہ پھیلی تھی۔

ممکن ہی کہ ملک صاحب نے اس نظم کو دہلی کے قریب ہی لکھا ہو اور وہاں سے پلٹ کر جائس میں پدماوت کی طرح ڈالی ہو۔

---

[1] آخری کلام میں ظہیر الدین بادشاہ کی مدح ان الفاظ میں کی گئی ہی:۔

بابر شاہ چھترپت راجا　　راج پاٹ اِن کا بدھ ساجا

[2] جائسی گرنتھاولی کی جدید اشاعت میں آخری کلام بھی شامل کر دی گئی ہی۔ اولاً یہ کتاب بھی فارسی رسم الخط میں تھی۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

اپنے پیر کی مدح فرماتے ہوئے کہا ہے:

۱۔ جو چالیس دن سیوئے | بار بہارے کوئے
درشن ہوئے محمّد | پاپ جائے سب دھوئے

ترجمہ} جو کوئی چالیس دن خدمت کرے اس کو درشن ملیں اور سب گناہ دُھل جائیں۔

۲۔ یہ سنسار سپن کر لیکھا | مانگت بدن نین بھر دیکھا
۳۔ کا موسوں اُن جھگر پسارا | حسن حُسین کہو کو مارا
۴۔ پن رسا ے کے کہے گسائیں | فاطمہ کا ڈھونڈو دینائیں
۵۔ پن رسول کنہ آیس ہوئی | فاطمہ کا سمجھاوؤ سوئی

۱ؔ
जौ चालिस दिन सेवै, बार वहारे कोइ
दरसन होइ "मुहम्मद" पाप जाय सब धोइ

۲ؔ
यह संसार सपन कर लेखा
मांगत बदन नैन भरि देखा

۳ؔ
का मोसौं उन झगर पसारा
हसन हुसैन कहौ को मारा

۴ؔ
पुनि रिसाइ कै कहै गोसाईं
फातिमा कहं ढूँढहु दुनियाईं

۵ؔ
पुनि रसूल कहं आयसु होई
फातिमा कहं समुझावहु सोई

۶۔ جو بی۔بی[1] چھاڑیں یہ دوکھو تو ئیں کروں اُمّت کے موکھو

پوستی نامہ بس اب ملک صاحب کی ایک تصنیف کا تذکرہ اور رہ گیا۔یعنی پوستی نامہ جس کے محض دو شعر دستیاب ہو سکے جو حاضر ہیں۔

جب[2] پستی مان لاگیں پات پستی کو دے نو نو ہات

ترجمہ} جب پوستے میں پتّے لگے پوستہ نو نو ہات کو دینے لگا۔

جب[3] پستی مان لاگیں پھول تب پوستی مٹکاوے کول

ترجمہ} جب پوستے میں پھول لگے تب کولھے مٹکانے لگا۔

متفرّق اشعار شاعر جائسی کے چند متفرق اشعار اور بھی سننے میں آئے ہیں جن کو اسی سلسلے میں خاتمۂ کلام کے طور پر بغیر کسی تمہید و تنقید کے اہل نظر کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ نیاو نہ کینھ کینھ ٹھکرائی ان کینھی لکھ دین بُرائی

ترجمہ} انصاف نہ کیا بلکہ ٹھکرائی کی یعنی جو بُرائی ہم نے کی بھی نہ تھی اس کو بھی ہمارے نامہ اعمال میں پہلے ہی سے لکھ دیا یا یہ کہ جو بُرائیاں ہم نے کی بھی تھیں انھیں "ان کینھی" لکھ کر مجھے معاف کر دیا۔

---

[1] जौ बीबी छांड़ाहूं यह दोखू
तौ मैं करौं उम्मत के मोखू

(आख़िरी कलाम)

[2] जब पुस्ती मां लागे पात। पुस्ती दूदे नौ नौ हात ॥
[3] जब पुस्ती मां लागे फूल। तब पुस्ती मटकावे कूल ॥

(पोस्ती नामा)

۲۔ ہمرے تو ایک محمّد پیارا   جیون مرن سہارن ہارا
ترجمہ} ہمارا تو بس ایک محمد پیارا ہے جو موت اور زندگی میں ہمارا مددگار ہے۔

۳۔ برست نور ہے تمھرے دوارا   کیسے نہ ہوے جگت اُجیارا
ترجمہ} (اے محمد) تمھارے دروازے سے نور برستا ہے تو پھر دنیا میں کیسے روشنی نہ ہو۔

۴۔ نرمل بھان ہو دو جگ ماہیں   چاند سُرج تمھری پرچھاہیں
ترجمہ} تم (اے محمد) دونوں عالم میں روشن سورج ہو بلکہ چاند اور سورج تمھارا عکس ہیں۔

۵۔ کون اس ٹھانوں جہاں پیت ناہیں
پھوٹ نین ترے سوجھت ناہیں
ترجمہ} کون سی ایسی جگہ ہے جہاں محبوب نہیں (البتہ) آنکھیں تیری پھوٹ گئی ہیں (اس لیے) دکھائی نہیں پڑتا۔

۶۔ ہے کرتار! تو سب کچھ دیںھا   ہم باور کچھ چیت نہ کینھا
ترجمہ} اے باری تعالیٰ تو نے ہم کو سب کچھ دیا لیکن ہم پاگلوں نے کچھ بھی دھیان نہ کیا۔

۷۔ تم ہو نور نور یزدانی   تمھری صفت کو ؤ نہیں جانی
ترجمہ} تم نور یزدانی ہو تمھاری صفت کسی نے نہیں جانی۔

۸۔ احد سے احمد بھیو ایک جوت دوی ٹھانوں
بھیو جگت کے تار نا پڑیو محمّد ناوں
ترجمہ} احد سے احمد ہوئے ایک نور دو جگہ دنیا کا نگہبان ہوا اور

محمد نام پڑا۔

۹۔ جہاں لوبھ تہنہ لابھ نہ کوئی جہاں لابھ تہنہ لوبھ نہ ہوئی

ترجمہ} جہاں لالچ ہوتا ہے وہاں فایدہ نہیں ہوتا اور جہاں فایدہ ہوتا ہے وہاں لالچ نہیں ہوتا۔

۱۰۔ جھ من پریم کہاں تن مانسو کایا رکت نہ نینن آنسو

ترجمہ} جس دل میں محبت ہے اس میں گوشت یعنی نفس کہاں اس کے تو نہ جسم میں خون ہوتا ہے نہ آنکھوں میں آنسو۔

۳۔ بارہ ماسہ

ہمچو ہندی زن کسے در عاشقی مردانہ نیست
سوختن بر شمعِ مردہ کارِ ہر پروانہ نیست

شیخ علی حزیں کا یہ شعر صرف ہندو عورتوں پر صادق نہیں آتا بلکہ کم و بیش ہندستان کی تمام عورتوں کے جذبات کی خاکہ کشی کرتا ہے خواہ وہ کسی فرقے اور ملت سے متعلق کیوں نہ ہوں۔

اپنے شوہر سے جو محبت ہندستانی عورت کرتی ہے ویسی تو کیا اس کا عشرِ عشیر بھی دوسرے سے ممکن نہیں۔

اس کی "آہ" میں درد اور اس کی "واہ" میں رازِ شگفتگی کھنچا ہوا چلا آتا ہے۔

وصل کا سکون اور ہجر کی بے چینی دیکھنی ہو تو کسی ہندی عورت کے وہ جذبات جن کا اظہار وہ اِن ہر دو مواقع پر کر رہی ہو ملاحظہ فرمائیے۔ آپ اپنے میں ایک قسم کی بالیدگی محسوس کریں گے جو روح سے تعلق رکھتی ہے۔

کون ہندستانی ہجراں نصیب عورت ہے جس نے اپنے آہ و نالہ سے دوسروں کو متاثر نہیں کیا۔ اور کون ہندی بیوی ایسی ہے جس نے آغوشِ وصل میں آکر محبت کی چاشنی کا مزا چکھایا ہو اور دنیا بے کیف رہی ہو۔

مبارک ہے وہ عورت جس کا جذبۂ لطیف ہجر کے غم اور وصل کی خوشی سے دنیائے محبت میں ایک کیف پیدا کر دیتا ہے۔

یوں تو اہلِ دل کے لیے ہجر و وصل دونوں ایک خاص لطف

رکھتے ہیں لیکن کچھ تو ہجراں نصیبی کی فراوانی اور کچھ اہل دل کا غم سے زیادہ میل جول، اِن دو باتوں نے داستانِ ہجر کو بہ نسبت افسانۂ وصل کے زیادہ عام کر دیا ہے چنانچہ ہر آنکھ میں اشکِ ہجر نظر آتے ہیں اور خال خال نہیں بلکہ بکثرت۔ یہ اور بات ہے کہ کسی جگہ اس کا اظہار مرد کی طرف سے ہو اور کہیں عورت کی جانب سے۔ ہندستانی معاشرت چونکہ مردوں کو بہ نسبت عورت کے بلند مرتبہ دیتی ہے۔ شاید اسی خیال سے اس معاشرت میں ہجر کے غم میں چیخ اُٹھنے کو اُس کی شان کے منافی قرار دے کر ایسے جذبات کے اظہار کا رواج عورتوں ہی کی طرف سے کیا جاتا ہے اور جذبات کا اظہار وہ مردوں سے بہتر کر بھی سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندستان کی زبانیں جو اپنی خلقت کے لیے کلیتاً یہاں کی معاشرت کی رہین منّت ہیں اسی طریقۂ تخاطب و اظہار جذبات کو اپنائے ہوئے ہیں۔

ہندی عورت کی ہجراں نصیبی کی داستانیں اتنی زیادہ ہیں کہ اس کی داستان غم نے ہندی ادب میں ایک مستقل جگہ حاصل کر لی ہے اور جو مقبولیت بارہ ماسا —— یعنی بارہ مہینے کے "ہجر کی داستانِ غم" کو حاصل ہے اس سے گویا سبھی واقف ہیں۔

غالباً اسی اعتبار سے شاعر جائسی نے بھی پدماوت میں شوہر کے ہجر میں ناگمتی کی بیقراری اور نالہ و غم کی تصویر کشی کی ہے جس میں اس اثر کے علاوہ جو ہر افسانۂ غم میں ہوتا ہے شاعرانہ محاسن اور تشبیہات اور استعارے کی خوبیاں بھی موجود ہیں۔

سب سے بڑی خوبی جو شاعر جائسی کے "بارہ ماسے" میں ہے وہ تشبیہات اور استعاروں کا مقامی اور ہندی ہونا ہے۔ ان کی تلاش کے لیے ملک صاحب ایران توران نہیں گئے بلکہ "قضیۂ زمین برسرِ زمین" کر کے ہم کو جذبۂ قومیت سے بھی آشنا کر دیا ہے۔

ناگمتی کے بارہ ماسے کے بعد ہزاروں بارہ ماسے ہندو اور مسلمان دونوں نے لکھے لیکن شاعر جائسی کا "بارہ ماسہ" ہندی ادب کی پہنائی (وسعت) میں آپ اپنی نظیر ہے۔[1]

ہندی عورت کی محبت کے عنوان ظاہر کرنے اور نیز یہ بتانے کے لیے کہ ایک باکمال شاعر زبان کو الفاظ کی تلاش اور جذبات کے برمحل صرف سے اس میں واقعیت کا کیسا رنگ بھر سکتا ہے "بارہ ماسے" کا اقتباس ترجمے کی شکل میں حاضر کیا جاتا ہے۔ اصل عبارت دوسری زبان میں ترجمہ ہو کر اور مترجم کی ستم ظریفیوں کے ہاتھوں پامال ہو کر جتنی بااثر باقی رہ جاتی ہے وہ اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں لیکن اگر ترجمے کی تمام خامیوں کے باوجود کلام کی قوت، اس کا اثر، اس کی روانی اور

---

[1] سنسکرت لٹریچر میں نک سک "(سراپا) کثرت سے پایا جاتا ہے اور ہمارے پاس کافی دلیلیں اس امر کے ثبوت کی ہیں کہ اس بارے میں جائسی نے اپنے پیش رو شعرائے سنسکرت سے استفادہ کیا۔ مگر اس کا بارہ ماسہ اپنے رنگ کا ایک ہی ہے۔ ہر ہندی داں جانتا ہے کہ بارہ ماسہ کیسا عام پسند اور ہر دل عزیز ہے۔ جائسی کے زمانے سے اب تک بے شمار بارہ ماسے لکھے گئے لیکن اس کے بارہ ماسہ کو کوئی نہ پہنچا۔

(مضمون لالہ سیتا رام۔ مندرجہ الہ آباد ہسٹڈیز سنہ ۱۹۳۰ء)

بلند تخیّلات پڑھنے والے کو اصل عبارت کی طرف متوجہ کرسکیں تو ظاہر ہی کہ اصل عبارت کتنی موثر، پُرشکوہ اور رواں ہوگی۔

گو یہ "بارہ ماسہ" پدماوت ایسی ضخیم کتاب کا ایک معمولی جزو ہی لیکن زبان، طرزادا، تشبیہ روانی، شیرینی اور سب سے بڑھ کر اپنے جذبات کی بنا پر بذات خود ایک تصنیف ہی۔ یہ بھی ایک وجہ یا عذر اس کے پیش کرنے کا ہوسکتا ہی۔

ناگمتی کا شوہر رتن سین اُسے چھوڑ کر پردیس چلا گیا ہی ناگمتی رانی ہی اور ایسی رانی جو اپنے شوہر پر کافی حاوی ہی۔ لیکن پھر بھی عورت ہی !! رتن سین ایک دوسری عورت کے فراق میں جوگی بن راج پاٹ چھوڑ چلا جاتا ہی اور سال بھر تک واپس نہیں آتا۔ اس درمیان میں ہندستان کا ہر موسم گزر گیا لیکن ناگمتی کا ہجر وصل سے نہ بدلا۔ شوہر کی فکر، سوت کی ڈاہ غرض سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ طرح طرح کے خیالات نے اور بھی زندہ درگور کر دیا تھا۔ لوگوں نے بہت سمجھایا بجھایا کہ رانی! جی بدمزہ نہ کرو۔ اُٹھو آئینے میں اپنی صورت تو دیکھو، سوچو، سمجھو اور دل کو قابو میں کرو۔ دیکھو بھنورا کنول کے ساتھ رہتا ہی لیکن جب مالتی کو یاد کرتا ہی تو کیسا دوڑتا ہوا آتا ہی۔ بادل کو زمین سے محبّت ہی تو ہوتی ہی کہ گھوم پھر کر کس طرح اُسے سیراب کرتا ہی۔ ناحق اپنے کو اس طرح ہلاک کرتی ہو۔ تمھارا شوہر جب تمھیں یاد کرے گا دوڑتا ہوا آئے گا۔ لیکن یہ سب سمجھانا بجھانا بیکار تھا۔ شدت غم کا یہ نتیجہ ہوا کہ رانی ہونے کی لاج بھی کھوئی۔ ناگمتی نے گھر بار چھوڑ کر جنگل کی راہ لی اور دیوانہ وار پھرنے اور جان

کھونے لگی۔

ناگمتی نے جس بے چینی سے جُدائی کے دن کاٹے اس کا تذکرہ بھی "بارہ ماسے" میں موجود ہے۔ ایک ایک چوپائی میں ایک ایک مہینے کی کیفیات کوزے میں دریا کی مصداق ہے۔

ملاحظہ ہو:۔

بارہ ماسہ

اساڑھ لگ گیا ـــــ بادل گرج رہے ہیں۔ اودے اور کالے پنکھ، پکھیرو، چیل، کوّے آسمان پر اُڑ رہے ہیں۔ سفید لگلے قطار در قطار دوڑ رہے ہیں۔ بجلی کی تلوار چاروں طرف چل رہی ہے۔ بوندیوں کے تیر زور وشور سے گر رہے ہیں۔ گھٹائیں اُمنڈ اُمنڈ کر آرہی ہیں! افواج ہجر میں باجے بج رہے ہیں۔ جدائی کا دکھ بڑھتا جارہا ہے۔ شوہر دیس سے باہر ہے اور میں آپے سے۔

پکھ نچھتر سر پر آگیا۔ مینڈک، مور اور کوکلا مست ہو کر پی ہو۔ پی ہو کہہ رہے ہیں اور میں بجلی کی چمک سے سہمی ہوئی خاموش!!

یہ موسم برسات کا اور میں ایسی خشک!! کون مکان درست کرے اور کون تخم ریزی کرے میری تو کوئی بات بھی نہیں پوچھتا۔

جس کا شوہر گھر میں ہے اُسی کو تمام عیش وآرام اور عزت حاصل ہے۔ میرا "پیا" تو پردیس ہے مجھے سارا سُکھ، چین بھول گیا۔

ساون کے پانی سے کھیتوں میں بھرنی لگی لیکن میں سوکھی کی سوکھی ہی ہوں۔ "پنربس نچھتر" بھی لگ گیا لیکن "پیتم کے درشن"

نہ ہوئے۔ اے پیارے تمھارے فراق میں میں باولی ہو گئی ہوں میرے آنسو زمین پر بیر بہوٹی کی طرح رینگتے پھرتے ہیں۔

سکھیوں نے اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ ہنڈولا رچایا ہے — ہری زمین اور بسنتی چولیاں — اور مجھے فراق پینگیں دے دے کر جھلا رہا ہے۔ میرا دل بھنبھیری کی طرح بھٹکا پھرتا ہے، راہ نہیں سوجھتی — ہرطرف پانی ہی پانی ہے۔ میرے دل کی ناؤ بغیر "کھیوک" کے تباہی میں پڑی ہوئی ہے۔

اے پیارے تم تک کیسے پہنچوں نہ میرے پانو ہیں نہ پنکھ ہے۔

بھادوں کی کالی راتیں اکیلے کیسے کاٹوں۔ شوہر نے تو دوسری بستی بسائی ہے۔ بستر ناگ کی طرح دھر دھر کے ڈستا ہے اکیلی ایک پٹی سے چمٹی پڑی ہوں۔ آنکھیں کھولتی ہوں تو ڈر لگتا ہے بجلی چمک کر اور بادل گرج کر ڈراتے ہیں۔ جب گھٹا جھکورے سے برستا ہے تو میری آنکھیں اولتی کی طرح ٹپکتی ہیں، دل پھٹا جاتا ہے۔ جدائی جان کو لگ گئی ہے۔ یہ مہینا تو پہاڑ ہو گیا۔ کاٹے نہیں کٹتا۔ بھرے بھادوں میں ایسی خشک ہوں اور تم کو خبر تک نہیں۔

پانی کی باڑھ سے جل تھل، زمین آسمان سب ایک ہو رہے ہیں اور میں جوانی کے اتھاہ جل میں ڈوب رہی ہوں۔ پی پیارے ہاتھ میں ہاتھ دو!!

کنوار لگ گیا۔ پانی گھٹ رہا ہے۔ اب بھی آجاؤ پیارے تمھارے آنے سے ترو تازگی پیدا ہوگی۔

آؤ پیارے آؤ دیکھو پپیہے "پی ہو" "پی ہو" کر رہے ہیں۔ سہیل

نکلا ہی۔ "ہتھیا نچھر" شروع ہوگیا۔ راجا زین کس کے میدان کو جا رہا ہی۔ آب نیساں سیپ کے مُنہ کو موتیوں سے بھر رہا ہی۔ سمندر اور سیپ سب موتی سے بھر گئے۔ ہنس سمندر کو یاد کر کے چلے آرہے ہیں۔ سارس کلیل کر رہے ہیں۔ سبزہ اُگ رہا ہی جنگل تک پھول رہے ہیں اب تو آجاؤ!!

دیکھو غمِ فراق مجھے کس طرح تباہ کیے ہوئے ہی۔ اے مرے کرشن آکر مجھے اُس سے نجات دلاؤ!!

کاتک کی چاندنی کتنی ٹھنڈی ہی تمام عالم سرد ہی ایک ئیں جل رہی ہوں۔ مرے تن من کو بستر جلائے ڈالتا ہی۔

سارے سنسار میں دیوالی کی دھوم مچی ہی۔ سکھیاں جھومک گا رہی ہیں لیکن مجھے کیا میری جوڑی تو مجھ سے بچھڑ گئی مجھے تو دنیا اُجاڑ معلوم ہوتی ہی۔

سکھیاں دیوالی گا کر تیوہار منا رہی ہیں میں کیا گاؤں تمھاری جدائی میں "بے سدھ" ہوں۔ اے دلدار دیکھو اب بھی آجاؤ۔

اگھن کی بھاری راتیں بہت دشواری سے کٹتی ہیں۔ اس طرح جلتی ہوں جیسے چراغ میں بتّی۔ دل سردی سے تھر تھراتا ہی تم ہوتے تو ایسا کیوں ہوتا۔

گھر گھر سجاوٹ ہی۔ ئیں کیا سنگار کروں میرا رنگ روپ تو شوہر کے ساتھ گیا۔ وہ پلٹے تو یہ پلٹے۔

سُلگ سُلگ کر خاک سیاہ ہوگئی۔ اب "برہ" کی آگ میں جل رہی ہوں۔ اس دُکھ درد کو پیارا کیا جانے۔

ای بھنورے، ای کوّے پیتم کو مری سنانی یوں سنانا کہ وہ برہ کی آگ میں جل گئی اُسی کا دُھنواں ہے جو ہم کو لگ گیا ہے۔

پوس کے جاڑے میں بدن تھر تھر کانپ رہا ہے سورج ڈوبتے ہی سردی نے زور باندھ دیا۔ بستر گویا برف میں ڈوبا ہوا ہے۔ کانپ کانپ کر جی نکلا جاتا ہے۔ "پیتم" کہاں کہ اس کو گلے سے لگالوں۔

چکوی رات کی جدائی کے بعد دن کو ملتی ہے۔ ایک میں ہوں کہ دن رات "برہ میں بیاکل"

خون بہا، گوشت گلا، ہڈیاں سنکھ ہوگئیں۔ عورت "پی ہو" "پی ہو" رٹ کر مرگئی۔ جب سکھی نہیں تو زندگی کیسی ہے۔

ماگھ کا مہینا ہے۔ پالا پڑ رہا ہے، جتنا جتنا روئی کے پہل سے بدن کو ڈھانکتی ہوں اتنا ہی دل اور کانپتا ہے۔

آنکھوں سے آنسو اس طرح بہتے ہیں جیسے مہاوٹ ہو رہی ہو۔ تمھارے بغیر پانی تلوار سالگتا ہے۔ فراق ہوا بن کر جھوے مار رہا ہے۔ کہاں کا بناؤ اور کیسا سنگار۔ فراق میں ڈورے کی طرح ہوگئی ہوں۔ جاڑا تو مجھ برہ کی ماری کے لیے آفتِ جان ہوگیا۔ ای پیارے سورج ہو کر تیو کہ تم بن ماگھ کا جاڑا جانے کا نہیں۔ تمھارے بغیر جسم بے حس ہے اور دل بے قابو اس پر بھی فراق کو چین نہیں چاہتا ہے کہ جلا کر "بھسم" کر دے۔

پھاگن میں ہوا کے جھونکوں نے سردی کو چوگنا بڑھا دیا ہے۔ وہ تو اب سہی نہیں جاتی۔ بدن پتّے کی طرح زرد ہوگیا پھر بھی فراق باز نہیں آتا جھنجھوڑے دیے ہی جاتا ہے۔

پتّے جھڑ گئے اور از سرِ نو پھر پھول پتّے شاخوں میں آئے سب کو خوش دیکھ کر میرا دل دونا رنجیدہ ہُوا۔

سارا سنسار مل کر پھاگ گا رہا ہی اور میرا بدن مثل ہولی کے جل رہا ہی۔ میرا یوں جلنا پیارے تم کو اگر پسند ہی تو پھر مجھے کوئی غم نہیں۔ میری تو خواہش ہی یہ ہی کہ مَیں تمھاری مرضی بجالاؤں کہ مٹی ٹھکانے لگے۔

اب تو میرے جی میں یہی آتا ہی کہ اپنا بدن جلا کر اُس کی راکھ ہوا میں اُڑا دوں کیا تعجب یہ اُس راستے پر جا پڑے جس پر تُو قدم رکھتا ہی۔

چیت کے ساتھ بسنت رُت بھی آگئی ہر طرف دھمار ہو رہی ہی۔ لیکن میری دنیا سُونی ہی۔ کویل کا پنچم راگ جُدائی میں تیر سا لگتا ہی۔ میرے خون کے آنسوؤں سے سارے جھاڑ جھنکار لت پت ہیں۔ ٹیسو اور مجیٹھ کو مَیں نے ہی رنگ دیا ہی۔ بالم آم میں بور آگئے اب تو گھر کی یاد کرو اور آؤ۔ جنگل میں ہزاروں طرح کی پتّیاں ہوتی ہیں لیکن بھنوّرا مالتی ہی کی تلاش کرتا ہی۔ نارنگی کی شاخ بہار پر ہی اس کو فراق کاہے کو باقی رہنے دے گا جس طرح کبوتر اپنے گھر پر ٹوٹتا ہی پیارے اُسی طرح آجاؤ۔ مَیں فراق کے پنجے میں ہوں بغیر تمھارے کیسے چھوٹوں۔

بسیاکھ میں لباس ہار اور چندن آگ معلوم ہوتا ہی۔ سورج کی گرمی شوہر کی چھانو سے سرد ہو سکتی ہی۔ آؤ پیارے انگاروں پر لوٹ رہی ہوں۔ تمھارے ہی آنے پر ٹھنڈی ہو سکتی ہوں۔ آؤ

اور آگ کو گلزار کرو۔ تمھاری جدائی میں بھاڑ کی طرح جل رہی ہوں۔
تم جتنا چاہے جلاؤ تمھارا دروازہ نہ چھوڑوں گی۔

دل کا تالاب روز بروز گھٹتا ہی جاتا ہی اور وہ وقت قریب ہی جب اس کی زمین تڑک جائے۔

(اُمید کا) کنول جو اس تالاب میں کھلا تھا "بن جل" مرجھا گیا اگر تم آکر "پریم جل" سے سینچو تو اب بھی اس کی بیل پھل پھول سکتی ہی۔

جیٹھ کا مہینا ہی۔ سنسار تپ رہا ہی۔ لُو چل رہی ہی، بگولے اُٹھ رہے ہیں، انگارے برس رہے ہیں اور برہ کی آگ لنکا پھونک کر اب مجھے جلا رہی ہی۔

چاروں اور کی ہوا آگ برسا رہی ہی، لنکا کو جلا کر پلنگ کو لگی ہی، جسم جل کر سیاہ ہو گیا۔ جدائی کی آگ کیسا پوشیدہ کام کرتی ہی۔

آندھی اُٹھ رہی ہی۔ آگ برس رہی ہی، مجھ دُکھیا کو کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ ادھ جلی ہو گئی ہوں، بدن کا گوشت سوکھ گیا۔ فراق موت بن کے پیچھے پڑا ہی مانس کھا کر اب ہڈی چبا رہا ہی۔ ہر شام کو تمھاری راہ دیکھتی ہوں۔ ای کرشن کی صورت والے اب بھی آجاؤ تم کو آتا دیکھ کر وہ بھاگ جائے گا۔

ای محمدؔ جو ایسی آگ میں جلے جس کو کوئی بجھا نہ سکتا ہو اس کو سراہنا چاہیے۔

اس طرح رو رو کے بارہ مہینے بسر کیے، ہزار دُکھ درد ایک ایک سانس میں جھیلے، ایک ایک پل پہاڑ ہو گیا اور ایک ایک پہر، ایک

ایک جگ، آخر کار ئیں نے مور کی طرح جنگل میں رہنا شروع کیا کہ شاید وہاں کچھ جی بہلے، کچھ پتہ چلے لیکن ع

بہلا نہ دل نہ تیرگیٔ شام غم گئی

اب تو تمھاری جدائی میں تنکا بھی تیر معلوم ہوتا ہی۔

چیل اور فاختہ کو ہر چند راستا بتاتی ہوں مگر کوئی نہیں سنتا۔ کوکلا کی طرح پکارتی پھرتی ہوں۔ اور مہری کی طرح "لے دہی" کی آواز لگاتی ہوں لیکن سب لاحاصل۔

درختوں پر بیٹھے ہوئے جب پکھیرو سے جدائی کا حال کہتی ہوں وہ درخت اور پرند دونوں جل کر خاک ہو جاتے ہیں۔ کیا کروں میرے رام!! برہ کے دن کیسے کاٹوں۔ ساجن تم تک آخر کیسے پہنچوں۔

کوک کوک کر اتنا روئی کہ خون کے آنسوؤں سے گھنگچی کا جنگل ہوگیا۔ کوئل کی طرح مُنہ سیاہ ہوگیا اور آنکھیں سُرخ، کون ٹھنڈا کرے۔ جدائی کا غم بہت تیز ہی۔ جہاں میں بن باسی کھڑی ہوتی ہوں وہاں گھنگچی کا ڈھیر لگ جاتا ہی۔ ہر ایک قطرۂ خون میری جان ہی گونج گونج کر مثل پپیہے کے "پی ہو۔ پی ہو" کرتی ہوں۔ مگر تم نہیں سنتے۔

میرے رنج سے ڈھاک بے برگ ہوگیا گیہوں کا دل میرے "بلاپ" سے پھٹ گیا۔ لیکن تم پر کچھ اثر نہ ہوا۔ میرے پیارے۔

مجھے تو ایسا جان پڑتا ہی کہ جہاں تم ہو وہاں نہ بھادوں ہوتا ہی نہ بسنت نہ "ہمنت"۔ وہاں کوئلیں اور پپیہے بھی نہیں ہوتے ورنہ تم انھیں کو سُن کر مجھے یاد کرتے۔ اور آتے۔

شاعر جائسی کی بھاکا

شاعر جائسی کی تصانیف آج سے تقریباً چار برس قبل کی ٹھیٹھ "اودھی بھاکا" (اودھ کی زبان) میں لکھی گئی تھیں لہٰذا یہاں اودھی زبان کے متعلق ضروری معلومات درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اودھی[1] زبان کی تاریخ

افسانوی عہد پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے اس لیے اودھی زبان کی صحیح تاریخ بتانا دشوار سا ہو گیا ہے۔ یقین کے ساتھ صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ برج بھاشا کی طرح اودھی بھی خالص ہندستانی زبان ہے۔ البتہ ایسی نہیں کہ دنیا کے پردے پر ازل سے رہی ہو۔ گیارھویں صدی عیسوی کے لگ بھگ اس زبان نے جنم لیا۔ اس کی عمر گویا آٹھ نو سو برس ہے۔

---

[1] اُردو میں حسب ذیل الفاظ ملک محمد جائسی ہی کے رایج کیے ہوئے ہیں۔ اُن سے قبل یا تو وہ قطعاً بولے ہی نہ جاتے تھے یا اُن کا استعمال نہ ہونے کے برابر تھا۔

ہندی میں رایج الفاظ	اُردو میں رایج الفاظ
طبل[1]، امیر[2]، امرا[3]، سلطانی[4]، سرتاج[5]، میر[6]، چنبر[7]، شیطان[8]، اسلام[9]، اسوار[10]، دربار[11]، شاہ[12]۔	انگارہ[1]، سوجھنا[2]، جگ[3]، پل[4]، درپن[5]، سراہے[6]، گرڈھ[7]، ججمان[8]، بنجارا[9]، پچنت[10]، مایا[11]، گھونگھٹ[12]، چندن[13]، تج[14] دینا۔

ہسٹری آف اردو لٹریچر مؤلفہ رام بابو سکسینہ صفحہ ۱۱۔

اودھی زبان کی خصوصیات[1]

اودھی زبان پوربی ہندی سے ملتی جلتی ہے اور برج بھاشا اور کھڑی بولی دونوں سے کئی باتوں میں مختلف ہے۔ مثلاً

۱۔ خالص اودھی کی بول چال میں فعل، فاعل کی ضمیر، جنس اور تعداد سے مطابقت رکھتا ہے۔ مفعول سے اس وقت بھی مطابق نہیں ہوتا جب کہ فعل متعدی ہو۔

۲۔ دو سے زیادہ اجزا والے الفاظ کے شروع میں "اِی" "इ" اور "اُو" "उ" کا تلفظ اودھی کو پسند اور پچھمی ہندی (کھڑی بولی اور برج بھاشا) کو ناپسند ہے۔ اسی اختلاف کی وجہ سے ایک ہی لفظ کو اودھی میں بالکسر یا بالضم جلی اور کھڑی بولی اور برج بھاشا میں بالکسر یا بالضم خفی بولتے ہیں۔ مثلاً اودھی میں

नीयाव نیاو	पीयार پیار	बीयाह بیاہ	बीयाज بیاج
कीयारी کیاری	सीयार سیار		दूआर دوار

کہیں گے اور کھڑی بولی اور برج بھاشا میں

कियारी کیاری	सियार سیار	दुआर دوار	नियाव نیاو	पियार پیار	बियाह بیاہ	बियाज بیاج

---

[1] اودھی کا یہ اصول اردو قواعد کے بھی خلاف ہے۔ اودھ کے رہنے والے اردو بولتے وقت عموماً یہی غلطی کرتے ہیں یعنی فعل متعدی استعمال کرتے وقت بھی فعل کی مطابقت مفعول سے نہیں کرتے۔ مثلاً بعض اوقات وہ کہتے ہیں کہ "میں نے روٹی کھایا" حالانکہ ہونا چاہیے "میں نے روٹی کھائی"۔

"ای" "इ" اور "اؤ" "उ" کی جگہ برج بھاشا اور کھڑی بولی میں "य" "ی" اور "व" "و" بولا جاتا ہے مثلاً اودھی میں "اہاں"، "اُہاں" اور کھڑی بولی اور برج بھاشا میں "یہاں"، "وہاں" بولتے ہیں۔

اسی طرح "अ" اور "आ" کے بجائے اودھی کو "इ" یائے معروف پسند ہے۔ اور برج بھاشا کو "य" "یا" یائے مجہول مثلاً اودھی میں "آئی"۔ "جائی" بولیں گے اور برج بھاشا میں "آئے" "جائے"

اودھی میں "ए" "اے" کا تلفظ "آئی" اور "او" "ओ" کا "अउ" "آوو" ہوتا ہے۔ مثلاً "ایس" "ऐस" "آئس" "आइस" یا "دوَر" "दऔर" "داور" "दाऔर" وغیرہ۔

۳۔ "ہونا" فعل کی شکلوں کے مادّے میں جو حرف "अ" پہلے رہتا ہے۔ وہ اب تک اودھ کے کچھ حصّوں میں ـــ جائس اور امیٹھی کے آس پاس ـــ بولا جاتا ہے۔ مثلاً "है" "ہے" کے بجائے "اہے" "अहै" کہیں گے۔ شاعر جائسی نے اہا "अहा" کہا ہے ممکن ہے بولا جاتا ہو۔

۴۔ کھڑی بولی اور برج بھاشا دونوں میں جو "صفات" اور تملیکی ضمائر "अ" "آ" اور "ओ" "او" پر ختم ہوتے ہیں وہ اودھی میں بلا "ا" "अ" یا "او" "ओ" کے ہوتے ہیں۔

کھڑی بولی	برج بھاشا	اودھی
ایسا	ایسو	ایس یا اَس

جیسا	جیسو	جَیس یا جَس
چھوٹا	چھوٹو	چھوٹ
اپنا	اپنو	اپن
میرا	میرو	مور
تیرا	تیرو	تور
ہمارا	ہمارو	ہمار

۵ کھڑی بولی میں تذکیر میں "کا" اور تانیث میں "کی" آتا ہے۔ برج بھاشا کا بھی یہی اصول ہے۔ اودھی کی بول چال میں تو یہ فرق ظاہر نہیں ہوتا البتہ ادبی زبان میں فرق ملتا ہے۔ شاعر جائسی نے تذکیر میں "کر" اور تانیث میں "کے" یائے مجہول سے استعمال کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اودھی میں تانیث میں "کی" یائے معروف سے کبھی نہیں ہوتا "ے" یائے مجہول ہی سے ہوتا ہے۔

۶۔ کھڑی بولی اور برج بھاشا دونوں میں حرف جار ہمیشہ فعل کے سادہ شکل میں لگتے ہیں جیسے "کرے کو" "کرن کو" لیکن ٹھیٹھ یا پوربی اودھی میں حروف جار ضمیر واحد متکلم میں لگتے ہیں جیسے "آوے کہہ" "کھائے مان" "بیٹھے کر"

۷۔ اودھی میں فعل حال ناتمام (PRESENT INDEFINITE TENSE) کی شکلیں برج بھاشا ہی کی سی ہوتی ہیں حرف ضمیر واحد حاضر کی صورت میں سنسکرت کی طرح "سِ" "सि" ہوتا ہے جیسے "کرس" "करसि" وغیرہ۔ امر میں بھی یہی صورت قایم رہتی ہے۔ گو کبھی کبھی آخر میں "ہی" "हि" لگا دیتے ہیں۔

۸۔ اودھی میں ضمیر متکلم فعل حال کے جنس تانیث کی صورتوں میں "पसि" اور "पनि" کی جگہ پر "इसि" اور "इनि" ہوتا ہے۔ جیسے "गइनि"، "लखिनि" وغیرہ۔ بول چال میں اکثر آخری "नि" نکال کر بچے ہوئے جز کی آواز کو نون غنہ سے بدل دیتے ہیں جیسے "लखिनि" "गइनि" کی جگہ "लखी" "गई" بولتے ہیں۔ شاعر جائسی نے بول چال کے اس روپ کو بھی دکھایا ہے۔

۹۔ پوربی اودھی میں ماگدھی کے رواج کے مطابق برج بھاشا کے "او" سے ضم ہونے والے ضمایر کی جگہ "اے" سے ختم ہونے والے ضمایر استعمال ہوتے ہیں جیسے کو، (کون) کی جگہ "کے" "جو" کی جگہ پر "جے" زیر کے ساتھ اور "کوؤ" کی جگہ پر "کیھو" یا "کیو"۔

۱۰۔ پوربی ہندی اور اودھی میں کہیں کہیں حرف جار مضمر ہوتے ہیں۔

۱۱۔ ٹھیٹھ اودھی میں مستقبل کی شکلیں کچھ بج کی ہوتی ہیں مثلاً ہوئے[1]۔ پاؤب[2] وغیرہ

---

[1] "ہوئے" پرانا لفظ ہے۔ اب اس کے بجائے "ہوئی" بمعنی "ہوگا" بولتے ہیں۔

[2] "پاؤب" یہ لفظ اودھی ادب کے جملہ ضمایر میں مستقبل ہے گو بول چال میں محض ضمیر جمع متکلم بھی "ہم" ہی کے ساتھ آتا ہے۔ شاعر جائسی نے جملہ ضمایر اور دونوں عددوں میں اس کا استعمال کیا ہے۔

پوربی اودھی میں مصدر کا اختتامی حرف بھی "ब" ہوتا ہے جیسا "پاؤب" میں ہے۔

برج بھاشا شاعری کی خصوصیات

برج بھاشا کی شاعری[1] کی سب سے بڑی خصوصیت جو اُس کو اکثر دوسری زبانوں خاص کر اُردو[2] سے ممتاز کرتی ہی اُس کا انداز تخاطب ہی۔ مایوسی، رنج، درد اور خوشی کے جذبات جس خوبی سے بھاشا کی شاعری میں ادا ہوتے ہیں دوسری زبان مشکل سے اتنی حسن ادا پر قدرت رکھتی ہی۔ غالباً اس کی بڑی وجہ یہ ہی کہ بھاشا کی شاعری میں جذبات کا اظہار عموماً عورت ہی کی طرف سے کیا جاتا ہی جو گویا مجسّم کرب و اضطراب ہی۔

دوسری خصوصیت یہ ہی کہ بھاشا کی شاعری میں استعارے اور تشبیہات عام اور مقامی ہوتے ہیں۔ جو شعر کو واردات کا درجہ دے دیتے ہیں۔

---

[1] اودھی اور برج بھاشا کی شاعری کی ابتدا کی صحیح تاریخ متعین کرنا دشوار ہی کہا تو یہ جاتا ہی کہ سنہ ۱۴۰۰ء سے قبل ہی اس کی ابتدا ہو گئی تھی اور "پشپے نانید" نام کا ایک شاعر سنہ ۱۴۰۰ء میں تھا لیکن اس کا کوئی کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ اسی طرح بار دیٹر اشاعر کا وجود سنہ ۱۰۸۶ء میں بتایا جاتا ہی لیکن کلام اس کا بھی محفوظ نہیں ہی۔

"چند بردائی" ہندی کا پہلا شاعر ہی جس کا کلام ہم تک پہنچا ہی اس کی معرکہ آرا تصنیف "پرتھی راج راسو" عہد پرتھی راج کا ایک روشن کارنامہ ہی جس کا حجم تقریباً ڈھائی ہزار صفحے کا ہی۔ اسی کو ہندی کا باوا آدم کہہ سکتے ہیں۔

[2] اُردو شاعری پر عام اعتراض ہی کہ اُس میں جذبات و احساسات اول تو غیر فطری ہیں اور حسن و عشق کے افسانوں تک محدود ہوتے ہیں۔ عاشق و معشوق کی محبت کے علاوہ دوسری قسم کی محبت کا انداز اُردو شاعری میں خال ہی خال نظر آتا ہی۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ بھاشا کا شاعر معمولی سی معمولی بات کو اس ڈھنگ سے بیان کرتا ہے کہ اُس میں ایک خاص بات پیدا ہو جاتی ہے۔

چوتھے یہ کہ بھاشا کے تھوڑے سے الفاظ کثیر معانی پیدا کر دیتے ہیں۔

مختصر یہ کہ بھاشا کی شاعری حسن و عشق، درد و غم، محاکات اور تخییل حسن ادا اور موسیقی کی ایک دل گداز تصویر ہوتی ہے۔

ملک محمد جائسی کی پدماوت اور دوسری تصانیف بھاشا شاعری کی جملہ خصوصیات کی تفسیر ہیں۔ ملک صاحب کا بارہ ماسہ، ان کا طرز ادا، اُن کے استعارات، تشبیہات اور الفاظ کا انتخاب بھاشا شاعری کی خوبیوں کی حامل ہیں۔

شاعر جائسی کی زبان کی خصوصیات

۱۔ اوزان کو پورا کرنے کے لیے الفاظ کا بے محل[1] استعمال یا قواعد کے اصولوں سے چشم پوشی شاعر جائسی کے یہاں بھولے نہ ملے گی۔

۲۔ کہیں کہیں تو غضب کی روانی پائی جاتی ہے۔ کہاوتوں، محاوروں

---

[1] مصنف جائسی گرنتھاولی کا قول ہے کہ "کہیں کہیں قواعد کے خلاف ایک آدھ لفظ مل جائے تو مل جائے جملے کے جملے ڈھیلے اور بے ڈھنگے کہیں نہ ملیں گے"۔ مصنف گرنتھاولی کا قول محض قیاس ہی ہے لیکن اگر واقعی ایک آدھ لفظ قواعد کے خلاف ملے بھی تب بھی ترتیب میں جس وسعت اور دقت نظر سے کام لیا گیا ہے اس کا اندازہ کرتے ہوئے ایسے الفاظ کو خلاف قواعد کہنا درست نہ ہوگا خاصکر جبکہ اس وقت کی قواعد کا مطلق ہم کو علم بھی نہ ہو۔

اور ضرب الامثال کا استعمال بھی شاعر جائسی نے کیا ہی۔ لیکن وہ بھاشا کے فطری طریقے سے نہ کہ محض شعر کے حسن ظاہری میں اضافہ کرنے کی غرض سے۔

۳۔ البتہ بعض مقامات پر محذوفات کا عیب ضرور موجود ہی جس کی وجہ سے کبھی کبھی بادی النظر میں مطلب خبط سا ہو جاتا ہی بعض مقامات پر تعقید کا عیب بھی ملتا ہی۔ لیکن یہ عیوب خال ہی خال نظر آتے ہیں۔

۴۔ شاعر جائسی کے دو لفظوں کا استعمال پڑھنے والے کو کچھ عجیب سا معلوم ہوگا۔ انھوں نے "نراس" لفظ کا استعمال "جو کسی کا ساتھی نہ ہو" کے معنوں میں کیا ہی۔

دوسرا لفظ ہی "بسواس" جیسے شاعر جائسی "بسواس گھات" کے معنوں میں لاتے ہیں۔ اسی طرح "بسواسی" "بواس گھاتی" کے معنوں میں کئی جگہ لایا گیا ہی۔ (بسواس گھات۔ فریب دینا۔ بسواس گھاتی۔ دغا باز)

۵۔ شاعر جائسی نے کہیں کہیں بہت پرانے الفاظ استعمال کیے ہیں مثلاً "دن کر" بمعنی سورج کو "دن ار" لکھا ہی۔ "شش دھر" کی بجائے "سسہر"۔ "بھوپال" بمعنی راجا کے بجائے "بھوال"۔ شش دھر بمعنی سانپ کے بجائے "بسہر"

اسی طرح "آدِ" "आदि" کا استعمال "بالکل" کے معنوں میں اب صرف بنگلہ زبان ہی میں سنائی دیتا ہی۔ لیکن شاعر جائسی نے پدماوت میں اسے استعمال کیا ہی۔

ایک بہت پرانا لفظ ہی "پے" "पै" جو "ہی" کے معنوں میں

آتا ہے۔ شاعر جائسی نے اس کو بھی استعمال کیا ہے۔

ایک اور پُرانا لفظ ہے "پشے" جس کے معنی ہیں "پر" اس کو بھی ملک صاحب لائے ہیں اور "بھے" کو بھی استعمال کیا ہے جس کے معنی ہیں "سے"

۶۔ ملک صاحب بعض مقامات پر نئے پرانے اور پوربی پچھمی دونوں طرح کے الفاظ لائے ہیں مثلاً پراکرت کا ایک لفظ تھا "سنتو" "सुंतो" جو سے کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ اس کی ہندی شکل "سینتی" "सेंती" بہت دنوں تک مستعمل رہی۔ ولی دکنی ایسے اُردو کے پرانے شعرا تک نے اس لفظ کو استعمال کیا ہے شاعر جائسی اس لفظ کو بہت جگہ لائے ہیں۔

۷۔ ضرورت شعری کی بنا پر اکثر حروف کو بدل دیتے ہیں مثلاً "دَل" کے بجائے "در" "بل" کے بجائے "بر" استعمال کرتے ہیں۔ ملک محمد جائسی نے ایسا بہت کیا ہے۔ انھوں نے "نربل" کے بجائے "نرمر" اور "کلا" کے بجائے "کرا" بھی استعمال کیا ہے۔ ضرورت شعری کی بنا پر مفرد الفاظ کو انھوں نے مرکب بھی کر دیا ہے مثلاً "ہنس" کو "ہنسا" "بول" کو "بولا"۔

۸۔ بول چال میں تلفظ کو مختصر کرنے کی عادت مستحسن متصوّر ہوتی ہے۔ اسی لحاظ سے "کر" کی جگہ "ک" بول دیتے ہیں۔ شاعر جائسی کے یہاں یہ مختصر شکل اکثر ملتی ہے۔

۹۔ ہندی کے اکثر شعرا پر لفظوں کے توڑنے مروڑنے اور اُن کی شکلوں کے مسخ کرنے کا الزام عاید کیا جاتا ہے۔ شاعر جائسی اس الزام سے بلند ہیں۔ پڑھتے وقت مصرع کے آخری مفرد لفظ

کو مرکّب کر دینے میں جتنا فرق لفظوں کی صورت میں پیدا ہوتا ہی اُس سے زیادہ اُن کے الفاظ کی شکل کہیں نہیں بگڑی۔

۱۰۔ شاعر جائسی نے ٹھیٹھ اودھی الفاظ کا بہت زیادہ استعمال کیا ہی مثلاً اُنھوں نے "راندھ" لکھا ہی جس کا استعمال اب صرف مرکّب شکل میں رہ گیا ہی جیسے "راندھ پروسی" اس کے علاوہ بھی ٹھیٹھ اودھی الفاظ ہیں جو ہندی ادیبوں کو دیہاتی معلوم ہوں گے مثلاً "نوج"۔ "موکا" "مھوں" وغیرہ۔

۱۱۔ شاعر جائسی نے "تو" یا "تیں" کی جگہ پر اکثر توی ___ کا استعمال کیا ہی۔ یہ قنوجی اور پچھمی کی وہ شکل ہی جو کھیری اور شاہجہاں پور سے لے کر قنوج تک بولی جاتی ہی۔

شاعر جائسی کی زبان بول چال کی سیدھی سادھی ہی۔ مرکّب الفاظ اوّل تو اُنھوں نے بہت کم استعمال کیے ہیں۔ جہاں کیے بھی ہیں دو سے زیادہ اجزا کے الفاظ نہیں لائے —— دو اجزا کے جو مرکّب الفاظ استعمال کیے بھی ہیں ان کو مفرد ہی سمجھنا چاہیے کیونکہ وہ سنسکرت کے طریقے کے مطابق نہیں بلکہ فارسی کے طریقے پر ہیں۔ جہاں بعض بظاہر مرکّب الفاظ دراصل مفرد ہی ہوتے ہیں —— —ایک جگہ پر تو پدماوت میں فارسی کا ایک فقرہ ہی اٹھا کر رکھ دیا گیا ہی "سرتاپائی" جو فارسی کا "سرتاپا" ہی۔

فارسی کی بس اتنی ہی جھلک کہیں کہیں دکھائی پڑتی ہی ورنہ شاعر جائسی کی زبان گویا سانچے میں ڈھلی ہوئی بہت ہی شیریں

اور دلکش ہے۔ شاہی دربار وغیرہ کے بیان میں "اراکان"۔ "بارگاہ" ایسے کچھ لفظ آ گئے ہیں لیکن وہ موضوع کے اعتبار سے ذرا سا بھی نہیں کھٹکتے۔

شاعر جائسی کی زبان کی چاشنی اور اس کا رسیلاپن نرالا ہے۔ اس میں برج بھاشا کی چاشنی ہے نہ کہ سنسکرت کی۔ اُس میں اودھی اپنی نج کی مٹھاس لیے ہوئے ہے۔ اگر اس کا اندازہ کرنا ہو کہ اودھی زبان کے بہتے ہوئے شیریں اور شفّاف چشمے تک شاعر جائسی کی کتنی پہنچ ہے تو پدماوت کی نزاکت تخیل، روانی، سلاست اور فصاحت کا مطالعہ ناگزیر سا ہوگا اس لیے کہ بقول مصنّف جائسی گرنتھاولی، اودھی کی خالص بے میل مٹھاس کے لیے پدماوت کا نام برابر لیا جائے گا۔

سنِ تصنیف

نظم پدماوت پر نقد و تبصرہ سے قبل اُس کا سنِ تصنیف معلوم کر لینا بوجوہ مناسب ہوگا سر جارج گری یرسن نے اس کا سن تصنیف ۱۵۴۰ء لکھا ہے جو ۹۴۷ھ ہجری کے مطابق ہے ہندی کے بیشتر ادیب بھی پدماوت کا سن تصنیف ۹۴۷ھ ہجری بتاتے ہیں اور پدماوت کے اس صدی کے نسخوں میں بھی تصنیف کا سن یہی ۹۴۷ھ ہجری ملتا ہے۔ نظم پدماوت میں شیر شاہ کی مدح اس کے زمانے کی سڑکوں کے تذکرے اور "راجا بادشاہ کھنڈ[1]" میں فرنگیوں کے ذکر کی بنا پر یہی سن تصنیف کا صحیح سمجھا جا سکتا ہے۔

---

[1] حاشیہ صفحہ ۱۹۱ پر ملاحظہ فرمائیے۔

تاہم اس کی صحت میں اختلاف ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ پدماوت ۹۲۷ھ ہجری میں لکھی گئی۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جو اس کی ابتدا ۹۴۷ھ ہجری قرار دیتے ہیں اور ۹۴۹ھ ہجری کو سن تکمیل بتاتے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک اس نظم میں گویا بائیس سال صرف ہوئے ہیں۔ یہ حضرات نظم پدماوت میں شیر شاہ کی مدح اور سن تصنیف کی چوپائیوں کے درمیان چھ چوپائیوں کا فصل ہونے کی وجہ سے جن میں ۔ مدح پیر، ذاتی حال، دوستیوں اور جائس کی تعریف و توصیف لکھی ہے، یہ استدلال بھی کرتے ہیں کہ مدح سرائی اور سن تصنیف میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ مدح کی چوپائیاں تکمیل نظم پر ۹۴۹ھ ہجری میں اضافہ کر دی گئی تھیں۔ اسی سلسلے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ملک صاحب نے شیر شاہ کو لفظ "سلطان" سے مخاطب کیا ہے اور چونکہ وہ ۹۴۹ھ ہجری میں دہلی کا "سلطان" ہوا تھا نہ کہ ۹۴۷ھ ہجری میں اس لیے اختتام کا سن ۹۴۹ھ ہجری ہے نہ کہ کوئی دوسرا سال اور نظم کے پرانے نسخوں میں بھی تصنیف کا سال ۹۲۷ھ ہجری ہی ملتا ہے۔

سنِ تصنیف پر محاکمہ | پدماوت ایک معرکہ آرا تصنیف ہے[۱] لیکن اس میں شاعر کی زندگی کے

حاشیہ صفحہ ۱۹۰

جبشی رومی اور فرنگی بڑ بڑ گُنی اور ست سنگی

اس شعر میں پرتگالیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کی طرف اشارہ ہے پرتگالیوں کا دور ۱۵۳۷ء مطابق ۹۴۵ھ کے لگ بھگ شروع ہوتا ہے یعنی ۹۲۷ھ کے بہت بعد۔

[۱] حاشیہ صفحہ ۱۹۲ پر ملاحظہ فرمائیے

بائیس سال صرف ہوئے ہوں قرین قیاس نہیں ممکن ہی اتنا وقت صرف ہوا ہو لیکن کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اس مدت کا شمار ۹۲۷ھ ہجری ہی سے کیا جائے یہ مدت ۹۴۷ھ ہجری سے بھی شروع ہوسکتی ہی۔

مثنوی کی مروجہ رسم کے خلاف ابتدا میں بادشاہ وقت کا ذکر نہ کرنا اور اس کے تذکرے کو بعد کے لیے اُٹھا رکھنے کی کوئی وجہ نہ بتانا اس رواج سے لاعلمی کا ثبوت ہی۔ آخر ایسا کیوں کیا گیا کسی دنیاوی لالچ سے یا کسی اور طمع سے، چند چوپائیوں کا فصل یا پُرانے نسخوں میں ۹۲۷ھ ہجری کا ہونا بھی کوئی قطعی دلیل پدماوت کے سن تصنیف کو ۹۲۷ھ ہجری قرار دینے کی نہیں ہوسکتی نہ اس فصل سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہی کہ مدح بعد میں "جوڑ دی" گئی ہی۔ خاص کر ایسی صورت میں جبکہ ملک صاحب کی ایک دوسری تصنیف یعنی "آخری کلام" میں مدح اور سن تصنیف کے درمیان بھی چار چوپائیوں کا فصل ہو اور سن تصنیف عہد بابر شاہ سے جس کی اس نظم میں مدح سرائی حسب رواج کی گئی ہی مطابقت[1] کرتا ہو ـــــ اس سے اس کا بھی ثبوت ملتا ہی کہ اگر ۹۴۷ھ میں

حاشیہ صفحہ ۱۹۱

اراکان کے راجہ کی سرپرستی میں پدماوت کا جو نسخہ تصنیف کے سو برس بعد بنگالی زبان میں ترجمہ ہوا ہی اس میں سن تصنیف ۹۲۷ھ درج ہی۔

[1] آخری کلام کا سن تصنیف ۹۳۶ھ ہی اسی طرح ہنس جواہر بھا کا مصنفہ میر قاسم کا سن تصنیف بھی ممدوح نظم محمد شاہ سے مطابقت رکھتا ہی۔

پدماوت نظم کی گئی ہوتی تو پدماوت میں ابراہیم لودی کی مدح ملتی نہ کہ شیر شاہ کی۔

یہ درست ہے کہ ۹۴۷ھ میں شیر شاہ دہلی کا سلطان نہ ہوا تھا لیکن یہ امر مسلّم ہے کہ وہ اس سے قبل ۹۴۷ھ میں ہمایوں[1] کو شکست دے چکا تھا اور دہلی کا لے لینا چند روز کی بات تھی۔ اس کے علاوہ تخت نشینی[2] کی رسم دسمبر ۱۵۳۹ء میں غوریا گور کے مقام پر ادا بھی ہو چکی تھی۔ جس طرح حسین میاں کو قطبین نے حسین شاہ لکھ دیا ممکن ہے اسی طرح شاعر جائسی نے شیر خاں کو دلّی کا سلطان بنا دیا ہو۔ مدح کی ترنگ میں اتنا مبالغہ ناروا نہیں سمجھا جاتا اور پھر شہرت انسان کے پیش پیش چلتی ہے۔ کیا تعجب کہ تخت نشینی کی رسم کے ادا ہونے اور شیر شاہ کی دلّی کی روانگی اور اس کی فتح یابی کی خبر خود شیر شاہ کے دہلی پہنچنے سے قبل ہی شاعر جائسی تک پہنچ گئی ہو۔

قصہ کوتاہ نظم پدماوت ۹۴۷ھ میں شروع کی گئی اور اسی وقت مدح بھی لکھی گئی ممکن ہے کہ ختم ہوئی ہو ۹۴۹ھ میں اور اس وقت ملک صاحب نے خود جا کر شیر شاہ کی خدمت میں پیش کیا ہو جیسا کہ مشہور ہے کہ ۹۴۹ھ میں وہ دربار میں گئے تھے۔

---

[1] شیر شاہ نے ہمایوں کو ۱۰ محرم ۹۴۷ھ مطابق ۱۷ مئی ۱۵۴۰ء میں شکست دی۔ ہمایوں کا پیچھا کیا۔ وہ کچھ دن آگرے میں رہا پھر دلی گیا۔ اس کے بعد جب ہمایوں نے دلی چھوڑی تو ۱۵۴۲ء میں شیر شاہ دہلی کا سلطان ہوا۔

[2] "شیر شاہ" مصنفہ قانون گو صفحہ ۲۰۸

رسم الخط ہندی کے متعدد ادیبوں کی رائے ہے کہ پدماوت اور ملک صاحب کی دوسری تصانیف کا رسم الخط فارسی تھا۔ سر جارج گری یرسن[1]، اوجھاجی[2] اور بابو شیام سندر وغیرہ نے پدماوت کے رسم الخط کو فارسی ہی قرار دیا ہے۔ اور اسی سلسلے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ چونکہ ملک صاحب کی تصانیف فارسی رسم الخط میں لکھی گئی تھیں اس لئے اُن سے اس عہد کی زبان، بول چال اور تلفّظ کا پتہ چلتا ہے کیونکہ ملک صاحب نے اُس رواج کی پروا نہیں کی جو قدامت پسند

---

[1] آج سے چالیس برس قبل سر جارج گری یرسن نے پدماوت کے رسم الخط کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"سولھویں صدی کے اوایل میں تصنیف ہوئی۔ اس میں ہم کو اُس زمانے کی زبان اور تلفظ کا پتا لگتا ہے۔ ہندو مصنّف قدامت پرستی کی وجہ سے اپنے الفاظ کے ہجا پرانے سنسکرت کے طریق کے مطابق کرتے تھے۔ لیکن ملک محمد نے اس کا اتّباع نہیں کیا"

یہی رائے سر جارج نے سدھاکر چندریکا کے دیباچے میں لکھی ہے۔

[2] اوجھاجی پدماوت کے سنہ تصنیف کو ۹۲۷ھ قرار دینے والوں کے قول کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "جائسی نے پدماوت ہندی میں لکھی یا اُردو میں ٹھیک معلوم نہیں لیکن ۹۴۷ھ کا ۹۲۷ھ ہو جانا ہی بتاتا ہے کہ یہ اختلاف اردو رسم الخط ہی کے سبب سے ہوا ہوگا۔"

"آگے چل کر آپ فرماتے ہیں کہ اگر اس کا رسم الخط ہندی ہوتا تو ہم کی جگہ ۲ پڑھا جانا قریب قریب ناممکن تھا۔"

ہندوؤں کو مجبور کرتا تھا کہ وہ اِملا کے معاملے میں تلفظ کا خیال نہ کریں بلکہ اپنے آبا و اجداد کا اتباع کرتے ہوئے الفاظ کو اسی طرح لکھیں جیسا کہ وہ سنسکرت میں لکھے جاتے تھے۔ انھوں نے اپنی تصانیف میں تلفّظ کو رواج دیا نہ کہ مستعمل اِملا کو۔

لالہ سیتارام نے بھی اپنے ایک مضمون میں جوالہ آباد اسٹڈیز (بابت ۱۹۳۰ء) میں شایع ہوا ہی سر جارج گری یرسن کی تایید کرتے ہوئے منظومات ملک خصوصاً پدماوت کے رسم الخط کو فارسی ہی قرار دیا ہی۔ لیکن بالکل حال میں سن تصنیف کی طرح رسم الخط کے متعلق بھی اختلافات پیدا ہو گیے ہیں اور ایک علمی بحث کا دروازہ کھُل گیا ہی کہ آیا شاعر جائسی کی تصانیف کا رسم الخط فارسی تھا یا ہندی۔ چنانچہ پدماوت کے رسم الخط کو ہندی قرار دینے کے لیے توجیہاً ایک بہت چھوٹی بات یہ کہی جاتی ہی کہ "مسلمان اہل قلم خصوصاً صوفیوں کا مقصد اپنے اصولوں کو ہندوؤں کے کانوں تک پہنچانا تھا اور غالباً ملک محمد جائسی کا بھی یہی مقصد رہا ہوگا۔ اس لیے انھوں نے پدماوت کو ہندی رسم الخط میں لکھا ہوگا نہ کہ فارسی رسم الخط میں، خاص کر اس وقت جبکہ اُردو کا لوگ نام بھی نہ جانتے تھے"۔ پھر یہ دیکھ کر کہ پدماوت کے جتنے نسخے ہندی رسم الخط میں ملتے ہیں وہ فارسی رسم الخط ہی سے نقل ہوئے ہیں یہ حضرات فرماتے ہیں کہ "بعد کو ان نظموں کو مسلمانوں نے اُردو رسم الخط میں منتقل کر لیا۔ کہنے کو تو یہ حضرات یہ کہتے ہیں لیکن اُن کے قول کی تردید خود اُن کی دلیل سے ہوتی ہی۔ اُردو کا نام نہ جاننا اور بات ہی اور فارسی الخط سے ناواقفیت اور بات ہی۔ اس لیے اگر شیر شاہ کے

وقت میں لوگ اُردو کا نام بھی نہ جانتے تھے تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ وہ فارسی رسم الخط سے بھی بے بہرہ تھے۔

دوسرے یہ کہ ایسے زمانے میں جبکہ آج کی سی آسانیاں طباعت کی فراہم نہ ہوں نظم یا نثر کی کتاب کا دایرۂ اشاعت محدود ہی ہوگا چاہے وہ کسی رسم الخط میں کیوں نہ لکھی گئی ہو۔ ایسے زمانے میں کسی کتاب کی مقبولیت ظاہر ہی کہ اسے دوسروں کو سنا کر ہی ہوسکتی تھی۔

اور یہ مشہور ہی ہی کہ ملک صاحب کے چیلے پدماوت کے دوہے پڑھ پڑھ کر لوگوں کو ملک صاحب کے کلام کی طرف متوجہ کیا کرتے تھے۔ پس پدماوت کے رسم الخط کے انتخاب میں کسی تبلیغی مقصد کو بھی دخل نہیں ہوسکتا تھا۔ اور اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ بھی فرض کرلیا جائے کہ ملک صاحب کا مقصد ہندوؤں میں تصوّف کے اصولوں کی تبلیغ ہی کرنا تھا تو ظاہر ہی کہ اس مقصد کا اولین نشانہ پڑھے لکھے ہندو ہی ہوسکتے تھے جن میں سے بیشتر فارسی پڑھ پڑھ کر دفاتر میں بڑے بڑے عہدوں پر مامور تھے۔ ان کے استفادے کے لیے بھی رسم الخط کو ہندی کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی عہد شیر شاہ میں فارسی رسم الخط کے دفاتر میں رواج اور ہندوؤں کی فارسی دانی سے انکار کرنا اس عہد کی معاشرتی اور تمدنی تاریخ سے کھلی ہوئی چشم پوشی کرنا ہی۔ اب رہ گئے وہ کٹر مذہبی ہندو جو املا میں آبا و اجداد کی حرف بہ حرف پیروی کرنا اپنا "دھرم" سمجھتے ہوں چاہے عام بول چال میں لفظ کہیں کا کہیں پہنچ گیا ہو اُن سے یہ امید کرنا کہ ملک صاحب کے کلام کو پڑھیں گے حسن ظن پر محمول کیا جاسکتا ہی پھر یہ بھی سمجھ میں نہیں

آتا کہ محض ہندوؤں میں رواج دینے کے لیے رسم الخط کے انتخاب کے معاملے میں ملک صاحب نے مسلمان صوفیوں کی تعداد کو کیسے نظرانداز کر دیا ہوگا۔

تعجب بالائے تعجب یہ ہے کہ ہندو جن کے لیے خاص طور پر رسم الخط کی طرح ڈالی گئی ہو اور جن کے یہاں اب ایم۔اے اور بی۔اے کے درس میں پدماوت شامل ہو وہ تو اس کی اتنی قدر کرتے رہے کہ اب اس کا ایک قدیم نسخہ تک اُن کے پاس ہندی رسم الخط میں محفوظ نہیں اور اردو داں طبقہ جن کی بیشتر فردیں ملک صاحب کی نظموں کے مطالب درکنار اُن کے الفاظ کو بھی نہ سمجھ سکتے ہوں وہ آج سے چند ہی سال قبل اپنی ادب نوازی کا یہ ثبوت دیں کہ ہندی رسم الخط سے پدماوت کے سارے نسخوں کو اُردو میں اس طرح منتقل کریں کہ چند سال میں ہندی رسم الخط میں نقل کرنے کے لیے اردو رسم الخط میں لکھے ہوئے نسخوں کو اصل قرار دیا جاتے۔ ایک اور دلیل ہندی رسم الخط کی تائید میں پیش کی جاتی ہے یعنی فارسی رسم الخط کے حروف تہجی (ALPHABETS) ہندی الفاظ کو صحیح طور پر ادا نہیں کر سکتے اس لیے ملک صاحب کی تصانیف کے لیے ان کا استعمال ناکافی ہے۔

ایسی صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ حروف جو فارسی حروف تہجی میں نہیں ملتے اس رسم الخط میں کیونکر ادا ہوئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر آج "ڈ" اور "ٹ" کو فارسی میں لکھنا چاہیں تو کس طرح لکھیں گے ؟ جس طرح ان الفاظ کو فارسی رسم الخط میں

لکھا جاتا تھا اسی طرح ملک صاحب نے بھی پدماوت میں ان الفاظ کو لکھا ہو گا۔

الغرض میری رائے میں ملک صاحب کی تصانیف کا رسم الخط فارسی تھا جیسا کہ ابتدائً جملہ منظومات کے اُردو رسم الخط میں دستیاب ہونے اور نیز سنہ ۹۴۷ھ کے سنہ ۹۲۷ھ ہو جانے سے بھی ظاہر ہے۔

سراپا

سنسکرت ادب میں "نکھ سکھ" (سراپا) کی ایک کثیر تعداد موجود ہی۔ پدماوت میں پدمنی کا "سراپا" دو مقاموں پر آیا ہی۔ ایک جگہ "توتے" کی زبان سے دوسری جگہ "راگھو" کی زبانی۔ تشبیہہ کی نزاکت اور معنویت کے ساتھ ساتھ ہندی مذاق سلیم کا جو نمونہ اِن دونوں سراپاؤں میں ملک صاحب نے پیش کیا ہی۔ اس کا اندازہ "سراپا" کے مطالعے ہی سے ہو سکتا۔ بھاکا کا شاعر اپنے سامنے کی تشبیہات کو استعمال کر کے کلام میں کتنی دل کشی اور دل فریبی پیدا کر دیتا ہی اس کا ثبوت ملک صاحب کا "بارہ ماسہ" اور "سراپا" ہیں جو نظم پدماوت کا ایک بہترین حصہ ہیں چونکہ ان دونوں "نکھ سکھوں" کے انداز بیان میں کوئی خاص فرق نہیں ہی اس لیے تمثیلاً "توتے" کا بیان کیا ہوا "سراپا" ترجمہ کر کے پیش کیا جاتا ہی۔

(۱)

اُس کا سنگار اُسی کو پھبتا ہی پھر کوئی اس کی شرح کیا کرے۔ اس کے موئے مشکین کا پیچ وخم (اس کی لہریں) سانپ کی طرح بل کھاتا ہی اور اس کا رنگ بھونرے کے مانند ہی جب چوٹی کھول کر بال جھاڑتی ہی تو سارا سنسار سیاہ ہو جاتا ہی۔ زہر آلود گھونگھر والے بال زنجیرِ محبت بن کر کسی کے گلے پڑنا چاہتے ہیں۔

(۲)

اُس کی بے سیندو بھری مانگ گویا اندھیری رین میں دیا کی جوت ہے، یا کسوٹی پر سونے کی لکیر، یا گھنگھور گھٹاؤں میں بجلی کی چمک، یا آکاش پر سورج کی کرن، یا جمنا میں سرستی۔ اور سیندور سے بھری مانگ تو خون میں بھری ہوئی تلوار معلوم ہوتی ہے۔

(۳)

اس کی چمکدار پیشانی کو ہلال کی روشنی سے تشبیہہ دینا غلط ہوگا کہ اس میں اتنی روشنی کہاں۔ سورج اگر ہزار درجے روشن ہو تب بھی اُس کی پیشانی کے نور کے مقابل نہیں ہوگا نہ کہ چاند جس میں عکس کا عیب ہے اور اس کی جبین میں یہ عیب نہیں۔

(۴)

اس کی بھنویں مثل سیاہ کمان کے ہیں۔ جس طرف رُخ کیا زہر کے تیر برسائے۔ یہی کمان کرشن کے پاس تھی یہی راگھو کے ہاتھ میں۔ اسی سے راون مارا گیا اور اسی سے کنس کی جان گئی۔ بھنویں کمان اور عورت کمان دار ایسی دھنک کا کون مقابلہ کرسکے۔

(۵)

دونوں آنکھیں گویا بحر زخار ہیں۔ سُرخ کنول سمجھ کر بھونرے منڈلاتے ہیں جس طرف اٹھی بے لگام گھوڑے کے مانند جا پہنچی۔ اس کی گردش سے زمین آسمان سب ہل گئے۔

(۶)

پلکیں کیا ہیں گویا دو فوجیں آمنے سامنے تیر لیے کھڑی ہیں۔ ادھر

رام کی سینا اُدھر راون کی فوجوں کے بیچ میں آنکھ کا سمندر حایل۔ کون ہی جو ان تیروں کا کشتہ نہیں سارا عالم انھیں کا پامال کیا ہوا ہی۔

(۷)

اس کی ناک کو تلوار سے کیسے تشبیہہ دوں۔ تلوار باریک ہوتی ہی اور وہ مناسب طور پر باریک اور موٹی اس کی ناک دیکھ کر توتا شرمندہ ہوا۔ توتے کی ناک سخت اور ٹیڑھی ہوتی ہی اور اس کی ناک نرم اور سُتواں۔ ہونٹ اور دانت کے قریب ناک ایسی معلوم ہوتی ہی کہ گویا توتے کے مُنہ میں انار کو دیکھ کر پانی بھر آیا ہی۔

(۸)

ہونٹ کیا ہیں آبِ حیات کے کوزے ہیں۔ ان کا رنگ مثل دوپہریا پھول کے ہی جب وہ بات کرتی ہی پھول جھڑتے ہیں۔ ہیرا اُس کے سامنے گرد ہی۔ جب وہ ہنستی ہی ایک عالم روشن ہو جاتا ہی۔ مُنہ سے پان کا رنگ ٹپکتا ہی۔ دیکھیے یہ آبِ حیات کسے نصیب ہو۔

(۹)

دانتوں کی بتّیسی مثل ہیرے کے تھی اور بیچ بیچ میں مسّی کی دھڑی جمی تھی۔ جس طرح بھادوں کی اندھیری رات میں بجلی چمکتی ہی اُسی طرح اس کے دانت چمکتے تھے۔ سورج، چاند، ستارے، جواہر، لال اور مونگے سب اِس دانت کی روشنی سے روشن ہیں۔

جب بجلی باوصف اتنی روشنی کے اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی تو پھر اور کون سی چیز اس کا مقابلہ کرسکتی ہی۔ مسکراتے وقت دانت میں سے ایسی چھوٹ پیدا ہوتی ہی جیسے سنگ سے شرار۔

(۱۰)

جب بات کرتی ہے زبان سے رس ٹپکتا ہے۔ اس کی آواز کے سامنے کوکلا، پپیہا اور بانسری سب ہیچ ہیں۔ اس کی گفتگو شراب محبّت سے بھری ہے جو سنتا ہے غش ہو جاتا ہے۔

(۱۱)

رُخسار کیا ہیں گویا ایک نارنگی کے دو ٹکڑے ہیں۔ بائیں رُخسار پر ایک تِل تھا جس سے لوگوں کے دل جلتے تھے۔ قطبیہ اُسے دیکھ کر انگشت بدنداں ہے۔ کبھی نکلتا ہے کبھی ڈوبتا ہے لیکن تِل کو چھوڑ کر اپنی جگہ سے نہیں ٹلتا۔

(۱۲)

صدفِ گوش (کان) اس کے گویا دو چراغ ہیں کانوں کی بالیاں گویا دو بجلیاں چمک رہی ہیں جب وہ دوپٹہ ہٹاتی اور اوڑھتی ہے تو گویا بجلی چمک کر رہ جاتی ہے۔

(۱۳)

اس کی گردن ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے کسی تار میں شیشی۔ طاؤس کی گردن اس کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ پھر نزاکت اتنی کہ پیک کی سُرخی تک نمودار۔

دیکھیے یہ گردن کس کی باہوں میں حمایل ہو۔

(۱۴)

سونے کے رنگ کے اس کے بازو اور کلائیاں۔ ایسی سڈول جیسے خرادی ہوئی۔ کسی کا دل نکال کر ہاتھوں میں لیا ہے جس سے انگلیاں

سُرخ ہیں۔ دنیا بے روح ہے۔ سارے سنسار کی آتما اس کے ہاتھ ہے۔

(۱۵)

سینہ تھالی ہے اور پستان لڈّو۔ جس طرح بھنورا اپنا ڈنک کیتکی میں ڈبوتا ہے اسی طرح پستان کے سرے چولیوں میں سوراخ کیے دیتے ہیں۔ کندن کے بیل کی انگیا سجا کر اس میں آب حیات کے دو کوزے بہ حفاظت رکھے ہیں۔ یا یوں سمجھیے کہ دو آہنی تیر ہیں جو اگر اس طرح بند نہ ہوں تو سنسار کو زخمی کریں۔ نیبو ایسی چھاتیوں کی چولی محافظ ہے۔ یہ نیبو دیکھیے کس کی قسمت کے ہیں۔

(۱۶)

پیٹ صندل کا سا خوشبودار اور زعفران کا سا رنگ والا۔ دُودھ بھی اس کو گرانی کرتا تھا۔ صرف پھول اور پان پر رہتی تھی۔ سینے کے بال کا سانپ ناف سے نکل کر پستان تک پہنچا وہاں موروں (یعنی سرپستان) کو دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گیا ناف اس کی بنارس کا گرداب ہے جسے جان عزیز نہ ہو وہ اس کے پاس جائے۔ پیٹ کے بال ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے بھونرے صندل کی خوشبو لینے کے لیے قطار در قطار جمع ہوتے ہیں۔ بہت سے گلا گھونٹ کر مر گئے مگر ایک کی بھی مراد بر نہ آئی۔

(۱۷)

چوٹی نے اس کی پیٹھ پر بڑی زیبا لیش پائی پیٹھ تختۂ صندل اور چوٹی سانپ، گویا سانپ لہریں مار رہا ہے اور دوپٹہ مثل کینچلی کے پڑا ہے ممکن ہے صندل کی خوشبو لینے سانپ چڑھا ہو۔ زلف رخسار پر بل کیا کھائی ہے گویا سانپ کنول کے پھول کو مُنہ میں لیے ہے یا چاند کو

گہن لگ گیا ہی جو اقبال مند ہو وہی اس سانپ کو دیکھے۔ سانپ کنول کے پھول کو منہ میں لیے بیٹھا ہی جو اُسے دیکھے اُسے تخت و تاج نصیب ہو۔

(۱۸)

ایسی کمر کسی کی نہ ہوگی۔ چیتے کی کمر اس کے مقابل نہیں۔ زنبور (بھڑ) کو ایک عالم باریک کہتا ہی حالانکہ اس کی کمر اس سے کہیں باریک ہی۔ یہی وجہ تو ہی کہ غم و حسد سے زنبور زرد ہو گیا اور اب انسانوں کو ڈنک مارتا ہی۔ دل کے اشارے سے کمر کو موڑتی ہی۔ قدم اُٹھا کر چلنے میں اندیشہ ہی ٹوٹ نہ جائے۔ شیر اس کی کمر کے مقابلے میں ہار گیا۔ اسی وجہ سے جنگل میں بھاگ گیا اور انسانوں کا خون اور گوشت اسی غصّے میں کھاتا ہی۔

(۱۹)

گرداب ناف ابھی تک مانند غنچہ کنول کے ہی معلوم نہیں کس بھنورے کی قسمت میں ہی۔ صندل کے تختے پر ناف مثل سُم آہو کے ہی۔ دیکھیے اسے کون پائے (دوپٹہ اس کے بدن پر ایسا تھا جیسے سمندر میں لہر)

(۲۰)

رانوں کی جوڑی ایسی جیسے خرادے ہوئے ستون۔ اس کے پانو مثل کنول کے پھول کے سُرخ۔ اس کے قدم دیوتا ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ جہاں وہ قدم رکھتی ہی وہاں دیوتا سر رکھتے ہیں۔ ہی کوئی ایسا صاحب اقبال جس نے اس کے قدموں پر سر نہ رکھا ہو؟

ای حُسن کی دیوی!! حق تو یہ ہی کہ تیرے سراپا کا وصف مجھ سے ممکن ہی نہیں اس لیے کہ

ع - ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

جائس

جائس اودھ کا ایک پُرانا اور تاریخی قصبہ ہے جو آج کل ضلع رائے بریلی میں ہے چونکہ بلندی پر واقع ہے اس لیے اس کی آبادی ایک حسین اور دلکش منظر پیش کرتی ہے۔

اولاً اس کا نام اودیا نگر تھا۔ اور یہ مقام "بھر" (راجپوت) قوم کا مستقر تھا۔ جب ۱۰۲۴ء میں سید سالار مسعود بعہد غیاث الدین ہندستان آئے اور ان کے نایب نجم الملک سیّد نجم الدین نے اسے فتح کیا تب سے اس کا نام "جائس" پڑا۔

جائس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں مختلف دلچسپ روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔

(۱) لشکر کا مستقر ہونے کے اعتبار سے مسلمان سپاہیوں نے "جیش" کہنا شروع کیا بعد کو "جیس" اور پھر جائس ہوگیا۔

(۲) سفر اور منازل کی صعوبتوں کے بعد جب اس قصبے میں اسلامی لشکر کو نسبتاً آرام اور سکون میسّر ہوا تو اظہار پسندیدگی کے طور پر لشکر کا لشکر چلّا اٹھا کہ "جائے ایست" یہی نعرۂ مسرت بعد کو بگڑ کر جائس ہو گیا۔ گویا جائس نعرۂ مسرت کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

(۳) جائس صیغۂ اسم فاعل ہے۔ اس کا مصدر ہے "الجوس والجوسان" جس کے معنی ہیں دشمن کو رات کے وقت مارنا ــــ چونکہ جائس شبخون مار کر فتح ہوا تھا اس لیے اس کا نام جائس پڑ گیا۔

(۴) ایک روایت جائس کو جائے عیش کی بدلی ہوئی شکل بتاتی ہے۔
مذہبی اعتبار سے جائس ہمیشہ ممتاز رہا اب بھی اکثر عمارات ہر مذہب وملّت کی جائس میں ایسی ہیں جو مذہبی اعتبار سے کافی شہرت اور مقبولیت رکھتی ہیں۔ جن میں سے ایک سیّد اشرف جہانگیر کی درگاہ بھی ہے۔ ان کے علاوہ وہ مقابر بھی ہیں جو فتح جائس سے متعلق ہیں اور جن کو اعتقادی نقطۂ نظر سے عوام نے مذہبی یادگاروں کا سا مرتبہ دے رکھا ہے۔

فتح جائس کے قبل یہاں کی آبادی کس ڈھنگ پر تھی معلوم نہیں۔ البتہ مسلمانوں نے آبادی کو بارہ حصّوں میں تقسیم کر کے ان حصّوں کا نام ان قبیلوں۔ کے نام پر رکھا جو اُن میں آباد ہوئے۔ انھیں حصّوں میں سے ایک کا نام "کنچانہ" ہے جو ملک صاحب کا مولد و مسکن ہے۔

اس سرزمین سے کتنے ہی علما، فقہا، حکما، شعرا، صناع، اہل سیف، اہل قلم، صوفی، رشی، مُنی اُٹھے اور اپنی قابلیت کا سکّہ بٹھا کر ایسے پیوند خاک ہوئے کہ آج تک گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں گو چند نامور فرزند جن سے جائس کی مردم خیزی کا پتہ چلتا ہے اب بھی موجود ہیں لیکن امتداد زمانہ کے کرشموں کے ہاتھوں ان کا تحفظ بھی مشکل ہی معلوم ہوتا ہے۔

جائس کی زمین زرخیز، آب وہوا خوشگوار اور آبادی کثیر تقریباً ۱۳۰۰۰ ہزار ہے۔ اس کے باغوں میں فواکہات کی فراوانی زمین کی زرخیزی کا پتہ دیتی ہے۔ اعلیٰ طبقے میں زیادہ تعداد مسلمان جاگیرداروں اور زمینداروں کے اخلاف کی ہے جن کو قدامت پسندی نے مفلسی کی ضمانت

میں دے دیا ہے۔ ہندوؤں میں علاوہ کائستھوں اور معدودے چند برہمنوں اور ٹھاکروں کے زیادہ آبادی شاگرد پیشہ لوگوں کی ہے۔ اس دیارِ علم و عمل میں اب عموماً بے علمی اور بے عملی کارفرما نظر آتی ہے۔ صنعتیں تباہ اور تجارتیں غارت ہو گئی ہیں۔ البتہ:۔

از نقش و نگار در و دیوارِ شکستہ　　آثار پدید است صنادید عجم را

ہماری زبان

انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) کا پندرہ روزہ اخبار

ہر مہینے کی پہلی اور سولھویں تاریخ کو شایع ہوتا ہے۔
چندہ سالانہ ایک روپیہ فی پرچہ پانچ پیسے

اُردو

انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شایع ہوتا ہے

اس میں ادب اور زبان کے ہر پہلو پر بحث کی جاتی ہے۔ تنقیدی اور محققانہ مضامین خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اُردو میں جو کتابیں شایع ہوتی ہیں، اُن پر تبصرہ اس رسالے کی ایک خصوصیت ہے۔ اس کا حجم ڈیڑھ سو صفحے یا اس سے زیادہ ہوتا ہے۔ قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات رُپے۔ سکۂ انگریزی (آٹھ رُپے سکۂ عثمانیہ) نمونے کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے (دو رُپے سکۂ عثمانیہ)

رسالۂ سائنس

انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) کا ماہانہ رسالہ

(ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد سے شایع ہوتا ہے)

اس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسایل اور خیالات کو اُردو دانوں میں مقبول کیا جائے۔ دنیا میں سائنس کے متعلق جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہوتے ہیں، یا بحثیں یا ایجادیں ہو رہی ہیں اُن کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے اور ان تمام مسایل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے اُردو زبان کی ترقی اور اہلِ وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے۔ رسالے میں متعدد بلاک بھی شایع ہوتے ہیں۔ قیمت سالانہ صرف پانچ رُپے سکۂ انگریزی (چھ رُپے سکۂ عثمانیہ)

خط و کتابت کا پتہ:۔ معتمد مجلس ادارت رسالۂ سائنس۔ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد۔ دکن

انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) دہلی

عام پسند سلسلہ

اُردُو زبان کی اشاعت و ترقّی کے لیے بہت دنوں سے یہ ضروری خیال کیا جارہا تھا کہ سلیس عبارت میں مُفید اور دل چسپ کتابیں مختصر حجم اور کم قیمت کی بڑی تعداد میں شایع کی جائیں۔ انجمن ترقیٔ اُردُو (ہند) نے اِسی ضرورت کے تحت عام پسند سلسلہ شروع کیا ہی اور اس سلسلے کی پہلی کتاب **ہماری قومی زبان** ہی، جو اُردُو کے ایک بڑے محسن اور انجمن ترقیٔ اُردُو (ہند) کے صدر جناب ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرُو کی چند تقریروں اور تحریروں پر مشتمل ہی۔ اُمید ہی کہ یہ سلسلہ واقعی عام پسند ثابت ہوگا اور اُردُو کی ایک بڑی ضرورت پوری ہو کر رہے گی۔ قیمت ۸ر

ہمارا رسم الخط

ازجناب عبدالقدّوس صاحب ہاشمی

رسم الخط پر بحث کی گئی اور تحقیق و دلیل کے ساتھ ثابت کیا گیا ہی کہ ہندستان کی مشترکہ تہذیب کے لیے اُردُو رسم الخط مناسب ترین اور ضروری ہی۔

گیارہ پیسے کے ٹکٹ بھیج کر طلب کیجیے۔

مینجر انجمن ترقیٔ اُردُو (ہند) ۱ دریا گنج۔ دہلی

(جید برقی پریس دہلی)